فنِ ترجمہ نگاری

ا ب ج د

अ क ख ज

ABCD

پروفیسر ظہورالدین

Scanned with CamScanner

URDU ADAB DIGITAL LIBRARY (BAIG_RAJ)

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری (بیگ راج)

+92 – 307 - 7002092

اُردو ادب ڈیجیٹل لائبریری اور ریختہ کُتب مرکز بیگ راج (1، 2، 3 اور برائے خواتین) گروپس میں تمام ممبران کو خوش آمدید اُردو ادب کی پی ڈی ایف کتابوں تک باآسانی رسائی کیلیئے ہمارے واٹس ایپ گروپس اور ٹیلی گرام چینل کو جوائن کریں۔ اور بلا معاوضہ باآسانی کتابیں سرچ اور ڈاؤنلوڈ کریں۔ واٹس ایپ پر خواتین کیلیئے علیحدہ گروپ بھی موجود ہے۔ نیچے دیئے گئے لنکس کی مدد سے باآسانی واٹس ایپ گروپ یا ٹیلی گرام چینل میں شامل ہوا جا سکتا ہے اور ایڈمن سے رابطہ کیلیئے ایڈمن کے نمبر پر کلک کر کے ڈائریکٹ ایڈمن سے رابطہ کیا جا سکتا ہے

منجانب : گروپ ایڈمن (بیگ راج)

واٹس ایپ لنک :

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/FSBIJHJMKBQBNKUPZFE5Z

HTTPS://CHAT.WHATSAPP.COM/HI9ER6LOZGP9MXZBUJQFZD

TELEGRAM - HTTPS://T.ME/JUST4U92

فیس بک پیج لنک : HTTPS://WWW.FACEBOOK.COM/ALMUGHAL.URDU.PAGE

Scanned with CamScanner

فنِ ترجمہ نگاری

پروفیسر ظہورالدین

سیمانت پرکاشن

922، کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج،

نئی دہلی ۔ 110002

rekhta

Scanned with CamScanner

(جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ)

ISBN : 81-87394-37-4

قیمت : سو روپے -/100

اشاعت : 2006ء

طباعت : کلاسک آرٹ پرنٹرز، دریا گنج، نئی دہلی۔2

ناشر : نریندر ناتھ سوز

سیمانت پرکاشن

۹۲۲، کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج، نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲

FUN-E-TARJUMA NIGARI *Prof. Zahur-ud-din*

SEEMANT PRAKASHAN

922, Kucha Rohella Khan, Daryaganj,
New Delhi-2. Phone : 011-23270284

Scanned with CamScanner

ترتیب

کچھ کتاب کے بارے میں 5

1۔ ترجمے کے مسائل 7

2۔ فن پارے کے ترجمے کے تقاضے 13

3 ۔ فن ترجمہ نگاری 19

rekhta

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کچھ کتاب کے بارے میں

زیرِ نظر مقالہ اُس تربیتی کو اس کی نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے جو شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی میں ایم۔اے۔اردو پروفیشنل کے نام سے عرصہ چار سال سے چل رہا ہے۔اس کورس کا مقصد اردو زبان کو اُسی طرح روزی روٹی سے جوڑنا ہے جس طرح انگریزی زبان جڑی ہوئی ہے۔

ترجمے کی اہمیت سے کس کو انکار ہے لیکن کامیاب ترجمہ کار کس طرح پیدا کیے جائیں یہ اس دور کا سب سے بڑا سوال ہے۔اب وہ زمانہ نہیں رہا جب زبان کے ہر طالب علم یا استاد کو ہر فن مولا سمجھ لیا جاتا تھا اور یہ یقین عام تھا کہ جو شخص ایک بار ایم اے کر لیتا وہ اُس زبان سے متعلق سب کچھ جانتا ہے اور ساری ذمے داریاں نبھا سکتا ہے۔ آج زمانہ خصوصی اہلیت (Specialization) یا غیر معمولی خصوصی اہلیت (Super Specialization) کا ہے۔جس کی وجہ سے ترجمے کا کام بھی انھیں کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کی باقاعدہ تربیتی سند حاصل کر کے اس میدان میں اترتے ہیں پھر یہ مقابلے یا مسابقے کا دور ہے۔ ہر چیز منڈی میں سجی ہوئی ہے اور گاہک مناسب قیمت پر اچھی چیز حاصل کرنے کا خواہاں ہے۔

یہ دونوں تقاضے آج بغیر تربیتی صلاحیت کے پورے نہیں کیے جا سکتے۔ پھر وہ یہ بھی جاننا چاہتا ہے کہ جس کو وہ اچھی اور مناسب قیمت رکھنے والی چیز سمجھ رہا ہے کیا اُسے کسی معتبر ادارے نے تیار کیا ہے؟ ورنہ ضروری نہیں وہ کسی چیز کو محض اچھی ہونے یا مناسب قیمت رکھنے کی وجہ سے

Scanned with CamScanner

خریدلے۔ مجھے بھی شاید ان کورسز کو جاری کرانے کا حوصلہ ہرگز نہ ہوتا اگر فلم اور ٹی۔ وی انسٹی ٹیوٹ پونا اور اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونی ورسٹی دہلی سے کچھ ایسے ہی تربیتی کورسز کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مجھے امید ہے ترجے کی تربیتی ضرورتوں کو پورا کرنے میں یہ مقالہ خاصا معاون ثابت ہوگا۔ اس کے بارے میں اپنی آرا سے ضرور نوازیں تاکہ اگلی اشاعت کے دوران آپ کی ضرورتوں کا خیال رکھا جاسکے۔

ظہور

Scanned with CamScanner

ترجمے کے مسائل

ترجمہ ایک ایسا فن ہے جس کی وساطت سے کسی ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں منتقل کر کے اُس زبان کے قارئین کو اس تک پہنچنے کے موقعے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اِسے ایک ایسی کھڑکی قرار دیا جاسکتا ہے جس کے کھل جانے سے ایک ایسی دنیا کے دروازے ہم پر وا ہوتے ہیں جس سے ہم اُس سے قبل بالکل واقف نہیں ہوتے۔ اس سے ہم نہ صرف متعلقہ فن پارے کی لسانی خصوصیات سے مستفید ہوتے ہیں بلکہ جس تمدن، قوم اور ملک کی وہ پیداوار ہوتا ہے اُس تک بھی پہنچتے ہیں، اُن احساسات و مدرکات سے متعارف ہوتے ہیں جو اُس مخصوص قوم کا سرچشمۂ حیات ہوتے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے ترجمہ افہام وتفہیم کے نئے دروازے کھول کر فکری و ماحولیاتی خلیجوں کو پاٹتا اور قربتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ نیز فکری و سماجی سطح پر آدان پردان کی حوصلہ افزائی کر کے انسانی آفاقیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یوں تو تخلیق کو بھی ہم ایک طرح سے ترجمے کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں کیوں کہ یہاں بھی فن کار اپنے خیال کی زبان میں مقید احساسات و مدرکات، تجربات و مشاہدات کو اپنی زبان کے وسیلے سے کاغذ پر اتار کر اپنی زبان کے قارئین کو اُس زبان وتمدن سے آشنا ہونے کا موقعہ دیتا ہے جو اُس کے خیال کی کائنات میں آباد ہوتا ہے لیکن یہاں تخلیق کار کو اُن دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا جو ترجمہ نگار کے حصے میں آتی ہیں۔ مثلاً ترجمہ نگار کو قلم اُٹھانے سے پہلے تخلیق کی وساطت سے تخلیق کار کے اُس زمان و مکاں تک رسائی حاصل کرنا پڑتی ہے جب اس فن پارے کی تخلیق واقع ہوئی۔ پھر اُن تجربات ومحسوسات کو اپنے وجود میں حیات نو عطا کر کے ایک بار پھر اُن سے گزرنا پڑتا ہے تاکہ اُن کی صحیح شکل وصورت سے آگاہ ہو کر انھیں

Scanned with CamScanner

اپنے قارئین تک پہنچا سکے اور اگر وہ زبان جس میں وہ اُسے ترجمہ کرنا چاہتا ہے بنیادی فن پارے کی زبان کے خاندان سے علاقہ نہیں رکھتی تو اُس کی مشکلیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اس صورت میں ضروری نہیں اُسے مطلوبہ مترادفات ہاتھ میں آجائیں۔ چناں چہ اُسے کسی تجربے کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کے لیے پہلے مترادفات تراشنا پڑتے ہیں۔ انھیں وجوہات کی روشنی میں اکثر ترجمے کو تخلیق سے زیادہ مشکل فن بھی قرار دیا جاتا ہے۔

کچھ لوگ تو اس خیال کے بھی حامی ہیں کہ اصل اور ترجمے کے درمیان قطعی تطابق ممکن ہی نہیں۔ دونوں زبانیں یعنی فن پارے اور ترجمے کی زبانیں چاہے ایک ہی خاندان سے متعلق کیوں نہ ہوں اگر ترجمہ نگار یہ سمجھتا ہے کہ وہ اصل کی روح کو قطعی طور پر ترجمے کے ذریعے اپنے قارئین تک پہنچا سکتا ہے تو وہ نہ صرف خود کو بلکہ اپنے قارئین کو بھی ایک ایسے دھوکے میں مبتلا کرتا ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ اس بات کی مزید وضاحت اس مثال سے کی جاسکتی ہے کہ اگر چہ اُردو اور ہندی ایک ہی خاندان کی زبانیں ہیں اور بسا اوقات ایک ہی سکے کے دو رُخ بھی لگتی ہیں۔ اس کے باوجود دونوں کے مزاج میں اس قدر فرق ہے کہ اگر اُس کو ذہن میں رکھے بغیر ایک ہی فن پارے کو دوسری میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے تو کبھی کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ترجمہ نگار کو صرف فن پارے کا مفہوم ہی دوسری زبان میں منتقل نہیں کرنا ہوتا اُس کے ساتھ جو مزاجی، تہذیبی اور فکری و جذباتی انسلاکات جزوِ لاینفک کی طرح موجود ہوتے ہیں اُن کو بھی منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اس منزل سے کامیابی کے ساتھ گزرے بغیر کوئی ترجمہ مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے بغیر کوئی ترجمہ تجربے کی منزل تک نہیں پہنچ پاتا اور جب تک وہ اس منزل سے ہم کنار نہیں ہوتا ترجمے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ جو لوگ ترجمے کا مطلب محض مفہوم کی ترسیل گردانتے ہیں وہ اصل فن پارے کی حرمت کو مجروح کرتے ہیں۔

اوپر پیش کی گئی رائے میں کچھ حد تک صداقت تو ضرور ہے لیکن اگر اس کا مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ ترجمہ کیا ہی نہیں جاسکتا تو مجھے ذاتی طور پر اس سے اتفاق نہیں۔ ترجمہ یقیناً ایک مشکل فن ہے اس میدان میں صرف اُن ہی لوگوں کو اترنا چاہیے جو اُن ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہوں جن کا یہ تقاضا کرتا ہے۔ مثلاً جب تک ترجمہ نگار دونوں زبانوں پر پوری طرح عبور نہیں رکھتا۔ دونوں کے تہذیبی، فکری، جذباتی انسلاکات سے واقف نہیں اور ترجمے کی قدرت نہیں رکھتا اُس وقت تک اُسے اس طرف قدم نہیں بڑھانا چاہیے۔ ورنہ اُس کی حالت اُس گھڑ سوار کی سی ہوگی جو شہسواری کے آداب سیکھے بغیر گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے گھڑ سوار کے انجر پنجر سلامت نہیں رہ سکتے۔

Scanned with CamScanner

اُردو اور انگریزی دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں ہیں۔ دو مختلف تمدنوں تہذیبوں کی پیداوار ہیں۔ دو مختلف مزاجی اور جذباتی کیفیات کی حامل بھی ہیں۔ اس لیے ایسے ترجمہ نگار کی ذمے داریاں بدرجہا بڑھ جاتی ہیں جو اُردو کے کسی فن پارے کو انگریزی میں منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے جب تک یہ معلوم نہیں کہ اُردو کے کسی محاورے کو انگریزی میں کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے یا انگریزی میں اس کا متبادل کیا ہے یا اگر متبادل نہیں ہے تو کن الفاظ میں مناسب طور پر اُسے یورپی قارئین کے لیے قابلِ فہم بنایا جاسکتا ہے، وہ اس میدان میں کامراں نہیں ہوسکتا۔ اُردو میں ایک محاورہ ''دل باغ باغ ہونا'' اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ادبی سطح پر ہی نہیں روزمرہ گفتگو کی سطح پر بھی اکثر استعمال ہوتا سنا جاتا ہے۔ غور سے دیکھیے تو یہ محاورہ اُردو والوں کی ایک جذباتی کیفیت کا ہی اظہار نہیں کرتا بلکہ اُن کی اُس اجتماعی و قومی مزاجی کیفیت کا بھی مظہر ہے جسے ہم مبالغے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مبالغے کو انگریزی و یورپی زبانوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس حد تک نہیں۔ اس لیے ہمیں اسے انگریزی میں ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ متبادل ایسا ہو جو انگریزی کے قارئین کے مزاج سے قریب تر ہو۔ چناں چہ یہاں ہمیں "over joyed" کی مدد سے ہی کام چلانا پڑے گا۔ یہ لفظ اُردو والوں کے لیے یقیناً ''دل باغ باغ ہونا'' کا مترادف نہیں ہے لیکن انگریزی کے قارئین تک اُس پیغام کو ضرور پہنچا دیتا ہے جو اصل محاورے میں مقید ہے۔ دونوں زبانوں سے پوری واقفیت رکھنے والا ترجمہ نگار چوں کہ یہ جانتا ہے کہ کس محاورے یا لفظ یا استعارے و تشبیہ کو دوسری زبان میں کن مترادفات کے ذریعے بہتر طور پر پیش کیا جاسکتا ہے اس لیے اُس کا ترجمہ اس شخص کے ترجمے سے یقیناً بہتر ہوگا جو اِس جوہر سے کماحقہٗ آراستہ نہیں ہے۔

اگر کوئی ترجمہ نگار دو سے زیادہ زبانوں پر دسترس رکھتا ہے تو اسے نیک فال تصور کرنا چاہیے کیوں کہ اس سے ترجمہ کرنے میں اُسے بڑی سہولت ہوسکتی ہے۔ مثلاً اگر وہ انگریزی کے کسی فن پارے کو اُردو میں منتقل کررہا ہے اور کسی لفظ یا محاورے یا تشبیہ و استعارے کے ترجمے کے دوران اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کی اپنی زبان میں اس کے لیے کوئی متبادل لفظ، اصطلاح یا محاورہ موجود نہیں لیکن کسی دوسری قریبی زبان یعنی فارسی، عربی، ہندی یا پنجابی وغیرہ میں ہے تو وہ اُس کی مدد لے کر اپنے ترجمے کو جاگزیں بنا سکتا ہے۔

اسی طرح ترجمہ نگار کا الفاظ شناسی کے ساتھ ساتھ اصطلاح سازی کے فن سے بھی متصف ہونا ضروری ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اصل فن پارے کی

of.RUBAB.Drma.ac.in

Scanned with CamScanner

بدل کے ساتھ اپنے ہاں استعمال کر کے زبان میں توسیع کا باعث ہو۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران ہمارے ترجمہ نگاروں نے اُردو زبان کے سرمائے میں جتنی اصطلاحوں، علامتوں اور لفظوں کا اضافہ کیا ہے اس کا صحیح اندازہ لگانا تو ممکن نہیں لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ترجمہ اکثر زبان کی ترقی کے امکانات روشن کرتا ہے۔ کیوں کہ اس سے اصل فن پارے کی زبان کی بہت سی نئی چیزیں جن میں الفاظ، احساسات اور تہذیب و تمدن شامل ہیں ترجمے کی زبان کا حصہ بن کر اس کی کائنات کو وسیع کرنے کا موجب ہوتے ہیں۔

ترجمہ نگار کی اپنی شخصیت بھی بسا اوقات اس کے کام میں معاونت کر کے اُسے کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ترجمہ نگار خود بھی تخلیقی ادیب ہے تو اس سے نہ صرف اُسے بنیادی فن پارے کی مناسب تفہیم اور اس کے دوسرے انسلاکات تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہوتی ہے بلکہ ترجمہ کرتے وقت وہ اُن احساسات و مدرکات کو بہ آسانی صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جو زیریں لہر کی طرح فن پارے میں ہر وقت موجود ہوتے ہیں اور جن تک تخلیقی ذہن ہی رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ خود بھی اُسی صنف سے تعلق رکھنے والا تخلیق کار ہے جس کا ترجمہ وہ کر رہا ہے تو کیا کہنے، پھر تو اس کے ترجمے کی کامیابی یقینی ہے۔ تاہم اس سے میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ دوسرے ترجمہ نگار بہتر کارکردگی کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ ترجمہ نگار کی مشق، اس کا مطالعہ و مشاہدہ اس کے تخلیق کار نہ ہوتے ہوئے بھی اُس سے اچھے ترجمے کرا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر عمر خیام کی رباعیات کے اُن ترجموں کو پیش کیا جاسکتا ہے جو فٹس جیرالڈ نے کیے ہیں یا اقبال کی اسرارِ خودی کے اُس ترجمے کو لیا جاسکتا ہے جسے نکلسن نے کیا ہے۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کا ترجمہ کرنا ناممکن اگر نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ نظم کا کارگاہ موضوع اور ہیئت کے خوبصورت امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس میں مفہوم کی قوسِ قزح کے ساتھ ہی آوازوں کا زیر و بم، الفاظ کی نشست و برخاست، ردیف و قافیے کا آہنگ نظم کی معنویاتی وحدت کو اُجاگر کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں اور ان تمام عناصر کا دار و مدار زبان کے اُس جمالیاتی آہنگ پر ہوتا ہے جو صدیوں کے سفر کے دوران وہ اپنے بولنے والوں کے فکری و جذباتی میلانات اور ماحول کے فطری تقاضوں کے درمیان تطابق پیدا کر کے اُسی طرح حاصل کرتی ہے جس طرح شہد کی مکھی ایک ایک پھول سے رس چوس کر شہد اکٹھا کرتی ہے۔ کسی مخصوص شعری آہنگ کا دوسری زبان میں اپنے سارے جمالیاتی انسلاکات کے ساتھ منتقل ہو جانا آسان نہیں ہے۔ اس لیے نظم کا ترجمہ اکثر و بیشتر ادھورا ہی رہتا ہے

Scanned with CamScanner

یہاں مفہوم تو منتقل ہو جاتا ہے، جمالیاتی آہنگ منتقل نہیں ہو پاتا کیوں کہ وہ اُس زبان کا جزو لاینفک ہوتا ہے جس میں نظم نے بنیادی طور پر جنم لیا ہے۔

نثر کے ترجمے کو اکثر آسان سمجھا جاتا ہے۔ ایسا صرف اُس نثر سے متعلق کہا جاسکتا ہے جسے سیدھی سادی نثر قرار دیتے ہیں۔ یعنی غیر تخلیقی صحافتی نثر۔ لیکن نثر کی اُس قسم کا ترجمہ جسے تخلیقی نثر قرار دیا جاتا ہے اور جو اکثر انشائیوں میں نظر آتی ہے اُس کا ترجمہ اتنا ہی مشکل ہے جتنا شاعری کا۔ مثلاً اگر انگریزی کے شہرۂ آفاق انشائیہ نگار بیکن کے انشائیوں کا اُردو میں ترجمہ کرنا مقصود ہو تو شاید ناکوں چنے چبانے کی نوبت آجائے، یہی صورت پطرس کے مضامین کے سلسلے میں بھی درپیش ہوگی۔

ہمارے ماہرین نے ترجمے کے فن کو جن دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے انھیں لفظی اور تخلیقی ترجمے کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لفظی ترجمے میں متعلقہ فن پارے کی عبارت کو اُس کی جملوی ترتیب کے عین مطابق ترجمہ کردیا جاتا ہے چاہے اس کی جملوی ساخت یعنی جملوں میں الفاظ کی نشست و برخاست قطعی ناموزوں ہی کیوں نہ ہو۔ ترجمے کی اس قسم کی خوبصورت مثال ہمیں قرآنِ کریم کے اُن نسخوں میں نظر آتی ہے جن میں الفاظ کے نیچے ہر لفظ کا اُردو ترجمہ دیا رہتا ہے اور ان کی نشست و برخاست کو اُردو کی جملوی ساخت کے مطابق بنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ لفظی ترجمے کی دوسری قسم وہ ہے جس میں ترجمے کے الفاظ کو اُردو کی جملوی ساخت کے مطابق کرلیا جاتا ہے۔

اس فن میں سب سے اہم قسم تخلیقی ترجمہ یا ادبی ترجمہ ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں کی گئی ہیں۔ پہلی قسم کے تحت صرف اُن تراجم کو رکھا جاتا ہے جو ادبی فن پاروں کو ایک زبان سے دوسری میں منتقل کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں کسی ادبی تحریر کو اس کے تمام انسلاکات کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں اپنی زبان میں منتقل کردیا جاتا ہے۔ یعنی یہاں بنیادی مقصد کسی فن پارے کو اس کی ساری ہیئتی و موضوعاتی خصوصیات کے ساتھ دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ہوتا ہے۔

تخلیقی ترجمہ، ترجمہ کم تخلیق زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں ترجمہ نگار کسی زبان کی ادبی تحریر سے متاثر ہو کر اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے اس کے خاکے پر اپنے تخیل کے عمل سے ایسا رنگ چڑھاتا ہے کہ وہ تخلیقی ترجمے کا روپ اختیار کرلیتا ہے۔ اس میں ترجمہ نگار اصل کتاب یا ادبی تحریر کا لفظ بہ لفظ ترجمہ نہیں کرتا، اس کے مجموعی مفہوم و تاثر کو اپنے تخیل کی بھٹی میں پکا کر یوں

Scanned with CamScanner

پیش کرتا ہے کہ وہ بذاتِ خود منفرد تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ تاہم یہاں ترجمہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کا ترجمہ کہیں اصل کتاب یا تحریر کی روح کو ہی زائل نہ کر دے۔ اسی خدشے کی وجہ سے ناقدین اس طرح کی کاوشوں کو ترجمے کے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔

بہر حال ترجمہ اب محض ایک فن ہی نہیں سائنس کا درجہ بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس کی وجہ سے افہام و تفہیم کے جو نئے رشتے اقوام کے درمیان قائم ہوئے ہیں ان کی ادبی و لسانی اہمیت تو مسلّم ہے ہی تہذیبی و تعلیمی اہمیت بھی کسی دوسرے علم سے کم نہیں ہے۔

rekhta

Scanned with CamScanner

فن پارے کے ترجمے کے تقاضے

ترجمہ ویسے ہی ایک بہت مشکل فن ہے اس پر اگر اُسے کسی ایسی تحریر سے بھی واسطہ پڑے جس کا اپنا وجود اِس قدر تہہ دار ہو کہ اُس کے اصل مفہوم تک رسائی حاصل کرنا ہی مشکوک نظر آئے یا یہ پتانہ چلے کہ اُس تحریر کا مصنف کیا کہنا چاہتا ہے تو ترجمہ نگار کی دِقتوں کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

یہ بات ہم سب کو بخوبی معلوم ہے کہ ترجمے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ ترجمہ نگار دونوں زبانوں سے کماحقہٗ واقف ہو۔ یعنی جس تحریر کا ترجمہ کرنا مقصود ہے اور جس زبان میں اُسے ترجمہ کرنا ہے اُن دونوں سے جب تک ترجمہ نگار پوری طرح واقف نہیں ہے ترجمے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبان اپنے ساتھ تہذیبی عناصر بھی لیے ہوئے ہوتی ہے۔ وہ اگر مُقامی اثرات سے بھی مملو ہو جو ہر تہذیب کے لیے ضروری ہے تو تہذیبی عناصر کے ساتھ ساتھ مقامی عناصر بھی اُس زبان کے کارگہ میں ضرور شامل ہوں گے۔ چناں چہ جب ہم کسی زبان پر عبور حاصل ہونے کی بات کرتے ہیں تو اُس سے مراد اِن سب عناصر سے واقفیت ہونا ہوتی ہے۔ محض الفاظ کے معنی جان لینا کافی نہیں ہے۔ آیئے اس بات کو ایک مثال کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو میں ایک لفظ آرسی موجود ہے جس کے معنی ہیں (۱) آئینہ (۲) ایک زیور جو عورتیں ہاتھ کے انگوٹھے میں پہنتی ہیں جس پر شیشہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس سے کچھ محاورے بھی بنے ہیں جن میں سے دو یوں ہیں:۔

(۱) آرسی تو دیکھو یعنی اپنی صورت تو دیکھو (۲) آرسی مُصحف دکھانا۔ یعنی عقد کے بعد دولہا اور دلھن کو آئینہ اور قرآن دکھانا۔ دولھا دلھن کو ایک دوسرے کا منہ دکھانا وغیرہ۔ جب تک یہ مفاہیم بھی ترجمہ نگار نہیں جانتا اور ان رسُوم کے عملی پہلوؤں سے بھی واقف نہیں کہ وہ کس طرح ادا کی جاتی ہیں اُس وقت تک وہ آرسی کا صحیح ترجمہ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے یہ کہا جاتا

Scanned with CamScanner

ہے کہ ترجمہ نگار کا صرف الفاظ کے مفاہیم سے ہی نہیں اُن کے جمالیاتی، تہذیبی اور مقامی انسلاکات سے بھی کما حقہٗ واقف ہونا بہت ضروری ہے۔

آیئے ایک بار پھر اُس موضوع کی طرف لوٹتے ہیں جس سے ہم نے آغاز کیا تھا۔ یعنی جب اُس تحریر کا موضوع اور مفہوم ہی معلوم نہ ہو جس کا ترجمہ کرنا ہے تو ترجمہ نگار اُسے کس طرح دوسری زبان میں منتقل کرے، دوسری شرائط تو بعد کی چیز ہیں۔ اب یہاں پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تحریر کا مفہوم واضح نہیں ہے تو اس سے ہماری مراد کس طرح کی تحریروں سے ہوتی ہے؟ میرا خیال ہے یہ بنیادی سوال ہے اور اس کا جواب دیتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں غیر واضح سے ہماری مراد وہ تحریریں ہیں جو تخلیقی ادب سے تعلق رکھنے کی وجہ سے معنویاتی اعتبار سے کثیر الجہت ہوتی ہیں یا جن کے متن کی دو یا کئی سطحیں ہوتی ہیں یا اس معنویاتی تہہ داری میں کچھ سطحیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو ایک دوسرے کی ضد قرار دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً اگر ایک سطح سے مراد دنیاوی زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے تو دوسری سطح کا حیاتِ دوام کا آغاز۔ موت کا مفہوم اگر اس زمین پر کی زندگی کا اختتام ہے تو اُسے دوسری طرف کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز بھی تو کہہ سکتے ہیں۔ اُسے ایک زندگی کے دکھوں کا خاتمہ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب کا آغاز بھی۔ اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترجمہ نگار کیا کرے اور کس طرح اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو؟ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ خیال کی ترسیل کے لیے زبان کا پیرایہ بہت ہی ناکافی ثابت ہوتا ہے۔ یہ ایک ازلی حقیقت ہے کہ انسان کو عطا کی گئی قوتوں میں سے جو قوت سب سے قوی ہے اور جس کا دائرہ لامحدود ہے وہ خیال کی قوت یا خیال کی زبان ہے۔ اس زبان کو الفاظ یا فنون کی زبان میں منتقل کرنا آسان نہیں کیوں کہ خیال کی ترسیل کے لیے انسان نے جتنے بھی وسیلے ایجاد کیے ہیں وہ نامکمل ہیں۔ چناں چہ اپنی دانست میں مکمل سے مکمل فن پارہ تخلیق کرنے کے بعد بھی فن کار اظہار کے عجز کا شکار ہو جاتا ہے۔ چناں چہ ترجمہ نگار جب اُس کا مطالعہ کرتا ہے تو اُسے، اگر وہ خود فن کار ہے، یہ صاف نظر آ جاتا ہے کہ الفاظ جو کچھ کہہ رہے ہیں اُس سے کہیں زیادہ فن کار کے استعمال کردہ الفاظ کی دسترس سے باہر رہا ہے۔ یا فن کار کے استعمال کردہ الفاظ بہت کچھ Between the Lines بھی کہہ رہے ہیں۔ اس بین السطور نیت کا ترجمہ کیوں کر ہو اور یہ بھی کہ جو کچھ فن کار کی دسترس سے باہر رہ گیا ہے اُس کا ترجمہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ اور اگر کیا جائے تو اس طرح کے ترجمے کو ترجمہ کہنا صحیح ہوگا یا تخلیقِ نو کیوں کہ ایک منزل پر پہنچ کر

Scanned with CamScanner

ترجمہ Re-Create بھی تو کرتا ہے یا اگر تھوڑا گہرائی میں جاکر سوچیں تو جس کو ہم تخلیق قرار دیتے ہیں وہ ایک طرح سے ترجمہ ہی تو ہوتی ہے اُن خیالات واحساسات کا جو ہمارے نفس میں اترنے اور وہاں اُس کی بھٹی میں تپنے کے بعد ایک قالب اختیار کر کے کاغذ، کینوس، پتھر یا ساز پر اترتے ہیں۔ ہاں البتہ یہاں بات اُس ترجمے کے ترجمے کی ہو رہی ہے جس کو فن کار نے اپنے خیال سے کاغذ یا کینوس پر اتارا ہے اور جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہے۔ ترجمہ نگار، اگر وہ بالیدہ ذہن اور فن کی بلندیوں سے آشنا ہے تو اپنے قلم یا مُوئے قلم سے تخلیق کی تکمیل کا باعث ہو سکتا ہے یعنی پہلے ترجمے کو جسے فن کار نے خیال سے کاغذ پر اتارا ہے دوبارہ اُسی سوتے تک رسائی حاصل کر کے پہلے ترجمے یعنی تخلیق، کی کمیوں کو دور کرنے کی وجہ بن سکتا ہے۔ اس کو خوب سے خوب تر کی تلاش کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ سارے فن کار و ترجمہ نگار انسانی زندگی اور اس کائنات کو خوب سے خوب تر بنانے کی ازلی و ابدی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ یہی انسانی زندگی یا اُس کے وجود کا مقصد اور جواز ہے۔ ذہین فن کار و ترجمہ نگار اس حیات و کائنات کو زیادہ سے زیادہ حسین اور مکمل بنانے میں ازلی فن کار و ترجمہ نگار کی مدد کرتے ہیں۔

اوپر پیش کیے گئے مسئلے کا ایک سیدھا سا حل تو یہ ہے کہ ترجمہ چاہے کسی سادہ تحریر کا ہو یا ادبی فن پارے کا تحریر کے سیاق و سباق کے حوالے سے اُس کے معنی متعین کر کے اُن کا ترجمہ کیا جائے اور جھنجھٹ میں نہ پڑا جائے کہ کسی تحریر کے سیاق و سباق سے ہٹ کر اور کتنے مفاہیم ہو سکتے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ہر جملہ ایک اقتباس کا حصّہ ہوتا ہے اور ہر اقتباس کسی مضمون کا۔ جس طرح ہر مضمون کا ایک مجموعی مفہوم ہونا ضروری ہے اُسی طرح ہر پیرے کا ایک مجموعی مفہوم بھی ہوتا ہے جو دوسرے پیروں کے ساتھ مل کر مضمون کے مجموعی مفہوم کی ترتیب و تشکیل کو ممکن بناتا ہے۔ جملہ چاہے کتنا ہی تہہ دار کیوں نہ ہو وہ اپنے پیرے کے تاثر سے باہر نہیں جا سکتا اسی لیے ایسی صورت حال میں فن پارے میں جملوں کے سیاق و سباق کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ اسی لیے یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ ادبی تراجم میں لفظ بہ لفظ یا جملوی تراجم سے احتراز کرتے ہوئے مجموعی تاثر یا مفہوم کو پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر جملے یا لفظ کا متبادل تلاش کرنے میں بعض اوقات ایسی دقتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ اُن کا صحیح مفہوم پیش کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ہمارے فاضل ترجمہ نگار ایسی صورت میں اکثر و بیشتر یہی راستہ اختیار کرتے رہے ہیں۔ اس بات کو چند مثالوں کی مدد سے مزید واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں:

Scanned with CamScanner

نظم طباطبائی کی نظم "گور غریباں" کو گرے (Grey) کی نظم Elegy in the Churchyer کا بہترین ترجمہ قرار دیا جاتا ہے لیکن دونوں کے تقابل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمہ نگار نے اپنے احساس جمال کی مدد سے نظم کے اُن گوشوں تک رسائی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو اَن کہے رہ گئے ہیں۔ پہلے اصل متن کا ایک بند دیکھیے:

"Full many a gem of purest ray serene
The dark unfathom'd caves of Ocean bear
Full many a flower is born to blush unseen
And waste its sweetness on the desert air"

اب ترجمہ ملاحظہ کیجیے:-

"بہت سے گوہر شہوار باقی رہ گئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہہ میں سمندر کی
ہزاروں پھول دشتِ دور میں ایسے کھلے ہوں گے
کہ جن کے مسکرانے میں ہے خوشبو مشک و عنبر کی"

ان دونوں اقتباسات کے تقابل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اردو کے منظوم ترجمے میں نظم طباطبائی نے اصل اقتباس کے کچھ الفاظ کو بالکل اپنے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً gem of purest ray serene کو اُس نے "گوہر شہوار" کہہ کر بات ختم کر دی ہے اور بالکل مناسب بھی ہے۔ کیوں کہ گوہر شاہوار "pure" بھی ہوتا ہے چمکدار بھی اور Serene یعنی پروقار بھی ایک استعارے نے انگریزی کے پانچ الفاظ کو یوں سمیٹ لیا کہ حُسن اصل سے کہیں بڑھ گیا۔ یعنی گرے سے جو کچھ کہنے سے رہ گیا تھا اُسے نظم نے شامل کر کے نظم کو مکمل کرنے کی کوشش کی۔ اسی کو تخلیقی ترجمہ کہا جاتا ہے جسے انگریزی میں The other original کی اصطلاح سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

میریڈتھ (Meridith) کی نظم "The young usurper" کا ترجمہ "ننھا غاصب" کے عنوان سے عظمت خان نے کیا ہے۔ اس کو بھی بہترین ترجمے کے زمرے میں رکھا جاتا ہے۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے اُسے بھی دیکھ لیا جائے۔ میریڈتھ یوں رقم طراز ہے:-

The young usurper
On my darling's bosom,
Fair as brilliant-Hesper,

Scanned with CamScanner

Against the brimming flood,
She handles him;
    She dandles him;
    She fondles him and eyes him,
And if upon a tear he wakes,
with many a kiss she dries him;
She covets every move he makes,
And never enough can prize him.

Ah the young usurper,
I yield my golden throne;
Such angels hands attend his hands
To claim it for his own.

اب لیجیے ترجمہ ملاحظہ کیجیے:-

ننھا غاصب

مرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ　　کھلا ہے محبت کا تازہ کنول
درخشندہ جیسے سرِ شام زُہرہ　　افق پر سمندر کے آئے نکل!
وہ ہاتھوں پہ اپنے کھلاتی ہے اس کو　　وہ پیروں پہ اپنے جھلاتی ہے اس کو
وہ رکھتی ہے آنکھوں پہ پتلی بنا کے　　وہ سوتے میں روتا جو اٹھ بیٹھتا ہے
تو بوسوں سے، موتی سے آنسو وہ پونچھے　　وہ سو جان سے ہر ادا پر فدا ہے
وہ ہے لال، دونوں جہاں جس پہ صدقے　　یہ ننھی سی جان اور غاصب کے دعوے
مرا تختِ زریں ہے تیرے حوالے　　ترے دست و بازو فرشتوں کے دستے
تو ہے وہ زبردست جیتے پہ جیتے

میریڈتھ کی ایک عام سی نظم کو عظمت اللہ خان نے چند الفاظ یا مصرعوں کے اضافے سے وہ تقدس عطا کر دیا ہے کہ داد دیے ہی بنتی ہے۔ مثلاً Darling یعنی محبوبہ کی جگہ دیوی کے لفظ کے استعمال سے نظم کی فضا ہی بدل جاتی ہے۔ منظر یہ ہے کہ ایک معصوم بچہ جسے نظم کے

Scanned with CamScanner

آخر میں فرشتے سا قرار دیا گیا ہے، ماں کے سینے پر سویا ہوا ہے۔ چوں کہ وہ فرشتہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی ماں بھی عام عورت یا محبوبہ نہیں کوئی دیوی ہو۔ اب غور کیجیے عظمت اللہ خاں ماں کے مرتبے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں جب کہ میریڈ تھ اُسے محض محبوبہ کے درجے تک ہی پہنچانا کافی سمجھتے ہیں۔ روزمرہ زندگی کا ایک عام منظر کس طرح الوہی منظر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اس کا اندازہ اس ترجمے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

نظم آگے بڑھتی ہے تو عظمت اللہ اس میں دو اور مصرعوں کا اضافہ کر کے جہاں اُسے اردو کلچر کی چاشنی عطا کرتے ہیں وہاں اُس کے مرتبے کو بھی مزید بلند کر دیتے ہیں۔ یہ دو مصرعے یوں ہیں:-

وہ رکھتی ہے آنکھوں میں پتلی بنا کے

اور

وہ ہے لال، دونوں جہاں جس پہ صدقے

اوپر پیش کی گئی مثالوں سے امید ہے کہ یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ ایسی تحریریں جنھیں کسی ایک مفہوم کے دائرے میں قید کرنا اُن سے صریح ناانصافی کے مترادف ہوتا ہے اُن کا ترجمہ کرتے وقت مجموعی خیال کی ترسیل تک ہی اکتفا کرنا چاہیے اور لفظی یا جملوی ترجموں سے جس قدر ممکن ہو پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

فن ترجمہ نگاری

ترجمے کی اصطلاح ذہن میں آتے ہی یہ سوال ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے کہ ترجمہ ہوتا کیا ہے اور آیا اس کی حدود کا تعین ممکن ہے بھی یا نہیں؟

ایک عام پڑھے لکھے انسان سے اگر یہ سوال کیا جائے تو وہ فوراً جواب دیتے ہوئے کہہ دے گا کہ کسی ایک زبان کی تحریر کو دوسری زبان میں ہو بہو منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ لیکن کیا یہ جواب اس طالب علم کی تشفی کے لیے کافی ہے جو ترجمے کا مطالعہ ایک ایسے فن کے طور پر کر رہا ہے جس کی صرف فنی و جمالیاتی ہی نہیں فلسفیانہ جہتیں بھی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ ترجمہ محض متبادل الفاظ تلاش کرنے کا نام نہیں یہ اُس سے کہیں زیادہ پیچیدہ، گہرے اور انکشافاتی عمل کا علامیہ ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

"Eversince man started to speak, he has an Urge to translate - to translate himself, and others"

(Art and science of translation) J.L Shastry

ترجمہ ہمیشہ سے افہام و تفہیم کا ذریعہ رہا ہے۔ اُس قدیم زمانے میں بھی جب باقاعدہ سفر اختیار کر کے دوسری اقوام تک پہنچنا ممکن نہیں تھا ترجمے کے ذریعے ہم ایک دوسرے تک رسائی حاصل کر کے جسمانی نہ سہی ذہنی رفاقت کا کچھ نہ کچھ حق ادا کرتے رہے ہیں۔ تاہم اس سے پہلے کہ ہم ترجمے کے آغاز و ارتقا اور فن کاری کی اہم منزل تک پہنچنے کے اس کے سفر کا جائزہ لیں یہ جاننا ضروری ہو جاتا ہے کہ ہمارے اہلِ دانش اُس کے بارے میں کس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

یوجین.اے.ندا اپنے ایک مضمون میں ترجمے کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"In view of the fact that one can translate without knowing anything about Linguistics, even as one can speak a language without being a student of the Science of language, many persons have concluded that translation is scarcely even an aspect of applied linguistics. Rather it has often been regarded only as a more complicated form of talking or writing, in which one decodes form one language and encodes into another."

(Science of Translation, Page 483)

جیسا کہ اس اقتباس سے واضح ہے، ترجمہ ایک زبان کے مافی الضمیر کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا نام ہے۔ یعنی ایک زبان میں جو کچھ کہا گیا ہے اُسے دوسری زبان میں پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اس عمل کی دو سطحیں سامنے آتی ہیں: (۱) پہلے بنیادی زبان جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس کے مفہوم کو ترجمہ نگار کا خود سمجھنا اور پھر (۲) اُسے اتنی ہی شفافیت کے ساتھ اس زبان میں منتقل کرنا جس میں ترجمہ کرنا مقصود ہے یا جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔

جناب کرشنا مورتی اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان A Set of postulates on Translation - theory and practice ہے، اس موضوع سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Translation is replacement of a text in Source Language (SL) by an equivalent text in a target language (T.L) so that (a) such a text fulfills a function in T.L equivalent to its function in SL, or (b) it can function as a cross- cultural event in T.L, as "an act of communication across cultural barriers."

Scanned with CamScanner

اس اقتباس کی روشنی میں کہہ سکتے ہیں کہ ترجمہ دو مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے: (۱) جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے اس کی کسی عبارت کو دوسری زبان، جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے، میں بالکل ویسی ہی کسی عبارت کی شکل دینا۔ یعنی یہاں مشابہت الفاظ کی نہیں اُن کے مفاہیم کی ہے یعنی جو مفہوم بنیادی زبان (SL) کے متن، جس سے ترجمہ کیا جارہا ہے، میں الفاظ کا ہے وہی مفہوم دوسری زبان کے الفاظ کے ذریعے اُس زبان (TL) میں منتقل کردیا جائے۔ یا پھر (۲) اس کے ذریعے تمدنی افہام وتفہیم کے مرحلے طے کیے جائیں۔ یعنی مفہوم اس طرح سے ادا کیا جائے کہ سورس لنگویج (یعنی جس زبان سے ترجمہ کیا جارہا ہے) بولنے والوں کے تمدن کے بارے میں بھی ٹارگٹ لنگویج کے قاری کو معلومات حاصل ہوجائیں۔

اس بات کو آیئے ہم ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں:

قرۃ العین حیدر کا ایک افسانہ ''آوارہ گرد'' ہے جس میں 'اوٹو' نام کا ایک جرمن لڑکا ساری دنیا کی سیر کرتا ہوا ہندوستان پہنچتا ہے۔ اُس کے پاس چوں کہ پیسے نہیں ہیں اس لیے جس کسی سے بھی راہ چلتے ہوئے اُس کی جان پہچان ہوجاتی ہے وہ اُس کے ہاں ٹھہر جاتا ہے اور اس سے تعارفی خطوط حاصل کرکے دوسرے شہروں یا ملکوں میں رہنے والے اُس کے دوستوں یا رشتے داروں کے ہاں بھی جا پہنچتا ہے۔ اسی طرح کا ایک خط لے کر وہ اس کہانی کے مرکزی کردار جو ایک خاتون ہے، کے ہاں جا پہنچتا ہے۔ اپنے معمول کے مطابق وہ دن بھر گھومتا پھرتا رہتا ہے اور شام کو واپس آجاتا ہے۔ ایک شام جب وہ تھکا ہارا لیکن بے حد ہشاش بشاش واپس لوٹتا ہے تو خاتونِ خانہ اُس سے دریافت کرتی ہے:

''اوٹو تم ایلیفنٹا گئے تھے؟ وہاں کی تری مورتی اور دیوتا ——''

اب اگر اس جملے کا ترجمہ کرنا مقصود ہے تو 'تری مورتی اور دیوتا' کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس کی وضاحت بھی کرنا پڑے گی کہ ہندو دیومالا میں تری مورتی کا کیا تصور ہے اور اُس کا ہمارے تمدن سے کیا رشتہ ہے؟

ترجمہ اگر ایک ہندوستانی زبان سے کسی دوسری ہندوستانی زبان میں کرنا مقصود ہے تو شاید بات سمجھانے میں دقت پیش نہ آئے کیوں کہ یہ تصور اُس زبان میں بھی ہوسکتا ہے کسی نہ کسی شکل میں موجود ہو۔ لیکن اگر اسے کسی یورپی زبان میں ترجمہ کرنا ہے جو Cognate زبان نہیں ہے تو پھر وضاحت خاصی تفصیل چاہے گی۔

Scanned with CamScanner

ہم اصل (Cognate) یا ملتی جلتی زبانیں وہ ہوتی ہیں جو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جیسے ہند آریائی، ہند ایرانی یا ہند یورپی خاندانوں کی زبانیں۔ اِن زبانوں کا جد ایک ہونے کی وجہ سے خاصا لسانی وفکری لین دین صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کے ہاں زندگی اور کائنات سے متعلق تصوّرات کا لین دین بھی ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر نظریات سے تعلق رکھنے والے الفاظ، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اُن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ چناں چہ اگر قطعی نہیں تو کم سے کم کام چلاؤ متبادل الفاظ ومحاورے تھوڑی سی کوشش کے بعد مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ کرنے میں خاصی آسانی ہوتی ہے۔

اگر سورس لنگویج (SL) یعنی جس زبان سے ترجمہ کرنا ہے اور ٹارگٹ لنگویج (TL) جس میں ترجمہ کرنا ہے، ہم اصل یا ملتی جلتی زبانیں نہیں ہیں۔ مثلاً اردو سے یونانی میں ترجمہ کرنا مقصود ہے تو تری مورتی اصطلاح کو جوں کا توں استعمال کرتے ہوئے اس کے تمدنی انسلاکات فٹ نوٹ یا پھر متن کے اندر ہی اس طرح دینے ہوں گے کہ متن کی روانی میں فرق نہ آئے اور بات بھی واضح ہوجائے۔ مثلاً اوپر پیش کیے جملے میں "تری مورتی" کی اصطلاح آتے ہی قوسین میں اس طرح "تری مورتی" کے بارے میں وضاحت کرنا ہوگی۔ "تری مورتی" کے اوپر حوالے کا نمبر ڈال کر نیچے حاشیے میں اس طرح وضاحت کی جائے گی:

متن

"اوتُم ایلیفنٹا گئے تھے؟ وہاں کی تری مورتی[1] اور دیوتا ——"

حاشیہ

1:

ترجمے سے متعلق ان ابتدائی معروضات کے بعد یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ترجمے کے بنیادی مقاصد کیا ہیں؟ ترجمہ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے اور آیا کیا فی الواقعی ترجمہ وہ مقاصد پورے کرتا بھی ہے یا یہ محض تضیع اوقات کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

ذرا یاد کیجیے کہ اوپر جناب کرشنا مورتی کے پیش کیے انگریزی اقتباس سے دو باتیں ہمارے سامنے آئی تھیں:

(۱) ترجمہ ایک زبان کے متن کو دوسری زبان کے ویسے ہی متن میں منتقل کرتا ہے اور

(۲) ابتدائی متن میں جو تمدنی انسلاکات ہوتے ہیں اُن سے بھی متعارف کراتا ہے۔

Scanned with CamScanner

معلوم یہ ہوا کہ ترجمے کا بنیادی مقصد کسی زبان میں کوئی بات کس طرح سے کہی گئی ہے اور اُس کہی گئی بات کا اپنے ماحول، تمدن اور عہد سے کیا رشتہ ہے، ان سے متعلق دوسری زبان جس میں ترجمہ کیا گیا ہے، کے قارئین کو متعارف کرانا ہے اور اگر اس تمدنی رنگ کا اُس زبان سے بھی کوئی تعلق ہے یا ویسی ہی کوئی بات اُس زبان میں بھی موجود ہے جس میں ترجمہ کیا گیا ہے تو پھر ترجمے کے ساتھ ساتھ اس شعور کو بھی عام کرنا مقصود ہے کہ قارئین کے سورس لنگویج سے لسانی ہی نہیں تمدنی رشتے بھی پہلے سے موجود ہیں۔ وسیع تر مفہوم میں اگر دیکھا جائے تو ان لسانی اور تمدنی رشتوں کی بازیافت سے اُس انسانی اور آفاقی رشتوں کو پروان چڑھانا مقصود ہے جو افہام و تفہیم کے ذریعے دنیا کو ایک گاؤں کی شکل دیتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترجمہ ایک ایسا آرٹ ہے جس کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ترجمہ کار میں کچھ ایسی خصوصیات کا ہونا ضروری ہے جو اُسے بیک وقت ادیب بھی بناتی ہیں اور صحافی بھی۔ ادیب کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے وہ اپنے وجود کے اندر بیٹھے ہوئے فن کار کی مدد سے اپنے سامنے موجود تحریر، جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہے، کی اُن ساری معنوی پرتوں کو ایک ایک کر کے اٹھاتا ہے تاکہ اُس مرکزی مفہوم تک رسائی حاصل کر سکے جو دراصل تحریر کنندہ کا مدعا و مقصد ہے یعنی جس کی ترسیل کے لیے دراصل اُس نے اُس تحریر کو لکھا اور صحافی کے طور پر کام کرتے ہوئے وہ اُس مفہوم کی معروضی پیش کش کو اُسی طرح ممکن بناتا ہے جس طرح صحافی کسی خبر کی بے لاگ پیش کش تک خود کو محدود رکھتا ہے۔ ان پہلوؤں پر مزید غور کرنے سے پہلے آیئے سیوری (Savory) کے اُن بارہ اقوال کا جائزہ لے لیا جائے جنھیں ونکٹیشور شاستری نے اپنے مقالے "Translation: A Craft" کے آغاز میں پیش کر دیا ہے۔

سیوری کے اقوال یوں ہیں:

"۱۔ ترجمے کو بنیادی تحریر کے الفاظ پیش کرنے چاہئیں۔
۲۔ ترجمے کو بنیادی تحریر کے خیال کو پیش کرنا چاہیے۔
۳۔ ترجمہ پڑھنے میں بھی بنیادی یا اصلی تحریر سا ہونا چاہیے۔
۴۔ ترجمہ پڑھنے میں ترجمہ لگنا چاہیے۔
۵۔ ترجمے کو اصل تحریر کے اسلوب کی عکاسی کرنا چاہیے۔
۶۔ ترجمے کا اسلوب ترجمے سا ہونا چاہیے۔
۷۔ ترجمہ اصل تحریر کا ہم عصر نظر آنا چاہیے۔

Scanned with CamScanner

۸- ترجمہ، ترجمے کا ہم عصر نظر آنا چاہیے۔
۹- ترجمہ اصل میں کمی بیشی کر سکتا ہے۔
۱۰- ترجمہ اصل میں کمی بیشی نہیں کر سکتا۔
۱۱- نظم کا ترجمہ منظوم ہونا چاہیے۔
۱۲- نظم کا ترجمہ نثر میں ہونا چاہیے۔"

(Art and science of translation by J.K Shastry)

(ص ۱۴۹، ۱۵۰)

سیوری کے مندرجہ بالا اقوال سے ترجمہ نگار کے کندھوں پر عائد ہونے والی ذمے داریوں کو وہ اُس وقت تک پورا نہیں کر سکتا جب تک (۱) وہ بنیادی متن کو پوری طرح سمجھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا تجزیہ کر کے کچھ عمومی نوعیت کے نتائج اخذ نہیں کر لیتا، اس سے پہلے کہ وہ اُس کا ترجمہ کرنے کے لیے کسی خاص اسلوب کا انتخاب کرے۔ متن کے منشا (موضوع، خیال) کو ترجمے کے متن میں پوری وفاداری سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ (۲) ترجمہ نگار کو متن اور اس کے قارئین دونوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ اس میں اُن کا تعلیمی معیار، عمر اور جنس بھی شامل ہیں۔ متن کے ماحول میں بنیادی متن (S.L Text) اور ٹی ایل ٹیکسٹ دونوں کی جائے اشاعت شامل ہیں۔ (۳) ترجمہ نگار کا مقصد متن کی آواز، مفہوم اور احساس کو واضح کرنا ہے۔ (To give the Sense and Sound, the feel of a text)

وینکٹیشور شاستری نے اپنے اس مضمون میں ترجمے کی دو قسموں کا ذکر کیا ہے ایک کو وہ مفہومیاتی ترجمہ (Semantic Translation) اور دوسری کو ترسیلی ترجمہ (Communicative Translation) کا نام دیتے ہیں۔ مفہومیاتی ترجمے کے دوران بنیادی یا اصلی متن کے سیاقی مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے اصلی متن کے جملوی ڈھانچے یا اس کی جملوی ساخت (Syntactic Structure) کو بھی برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس طرح کا ترجمہ اکثر و بیشتر سورس لنگویج (SL) کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ یہ ترجمہ خاصا پر مغز، پیچیدہ اور تفصیلی ہوتا ہے۔ خیال کے سلسلے کی تو عکاسی ہوتی ہے پر الفاظ اور ادیب کی منشا زائل ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ ضرورت سے زیادہ ترجمہ ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ مفہومیاتی ترجمے میں اصلی متن سے زیادہ تخصیصی ہو جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ نگار کسی ایک ترجمے یا مفہوم کی تلاش میں بہت سے مفاہیم شامل کر دیتا ہے۔ اس میں موضوع اور ہیئت دونوں کو ایک یونٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اسے

Scanned with CamScanner

زیادہ تر قاموسی ترجمہ گردانا جاتا ہے۔ روایتاً اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ جہاں اسلوب اور مواد ایک ہوں وہاں مفہومیاتی ترجمہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ مفہومیاتی ترجمہ زیادہ انفرادی نوعیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ اپنی توجہ سورس لنگویج کے متن کے مفہومیاتی سیاق پر مرکوز کرتا ہے۔

وینکٹیشور شاستری ترسیلی ترجمے (Communicative Translation) کی مندرجہ ذیل خصوصیات بیان کرتے ہیں:

۱- اس طرح کا ترجمہ قارئین پر اُسی طرح کا اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے جیسا سورس لنگویج کے قارئین پر پڑا ہوتا ہے۔
۲- یہ ترجمہ اتنا سادہ، آسان اور براہِ راست ہوتا ہے کہ ٹارگٹ لنگویج کے قارئین اس کی زبان، کلچر، جذباتی اقدار اور کبھی کبھی نئے نظریات کو فوراً قبول کر لیتے ہیں۔
۳- یہ موضوع پر توجہ نہیں دیتا بلکہ اُس کی قوت سے ہی تشفی پاتا ہے۔
۴- یہ اصلی متن کے موضوع، خیال اور تمدنی پہلوؤں کو قاری سے قریب کر دیتا ہے۔
۵- ترسیلی ترجمہ کام چلاؤ (Functional) ہوتا ہے یعنی زاویۂ نظر کے اعتبار سے سماجی ہوتا ہے۔
۶- ترسیلی ترجمہ لازماً افہام و تفہیم اور قاری کے ردِ عمل پر توجہ دیتا ہے۔

یہاں یہ بات کہہ دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ وینکٹیشور شاستری نے یہ دو اصطلاحیں Newmark (1981) سے مستعار لی ہیں۔

ہمارے ایک اور ماہر ترجمہ نگار جناب کاشی پرساد اسی موضوع سے بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " We may at the outset ask: What does translation aim at? What is an ideal translation? To be precise, it is an attempt to recreat, as far as possible, for the reader of the target language, i.e, the language in which the translation is made, the experience of the reader of the source language."
>
> (Some problems of translation from Indian language - with special reference to Prem Chand, Indian leterature, Page 86)

Scanned with CamScanner

اس اقتباس پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ موصوف کی نظر میں ترجمہ اگر چہ تخلیق نو کا درجہ رکھتا ہے لیکن اُس کا بنیادی کام دراصل اُس زبان کے قاری کے لیے جس میں ترجمہ کیا جا رہا ہے (T.L.) بنیادی متن (جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے) کے قاری کے تجربے کو از سرِ نو تخلیق کرنا۔ یعنی سورس لنگویج کے قاری کے تجربے کو ٹارگٹ لنگویج کے قاری کے لیے از سرِ نو تخلیق کرنا۔ یہاں تخلیق کرنے کے معنی کسی فن پارے کی شکل میں ترجمہ کرنا نہیں بلکہ منتقل کرنا ہے اس انداز سے کہ اُس زبان کے قاری کو پوری طرح معلوم ہو جائے کہ سورس لنگویج کے قاری نے اُس کا کیا مفہوم متعین کیا ہے۔

یہاں اس بات کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ کاشی پرساد یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ بنیادی متن کے مصنف نے جو کہنا چاہا ہے اس کا ترجمہ کیا جائے بلکہ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ سورس لنگویج یعنی بنیادی متن کے قاری نے اس کو پڑھ کر جو تجربہ حاصل کیا ہے یعنی اُس کا جو مفہوم اس کے تجربے میں آیا ہے اُسے ترجمے کی زبان میں شفاف انداز میں منتقل کر دیا جائے۔ کاشی پرساد کے اس قول سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ شاید یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر متن کو معنی مصنف نہیں قاری ادا کرتا ہے۔ یا شاید وہ اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ مصنف نے چاہے اپنے متن کو کوئی بھی معنی عطا کیے ہوں ترجمہ ہمیشہ اُن معنوں کا ہوتا ہے جو ترجمہ نگار ایک قاری کی حیثیت سے متعین کرتا ہے۔ اس خیال کے بارے میں آگے مزید گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

جناب این. آر. شاستری کا حسب ذیل اقتباس بھی ترجمے کی نوعیت کو سمجھنے میں ہماری خاصی مدد کرتا ہے:

> "Translation may be broadly defined as the process of retaxualising the source language (S.L) discource process in the target language (T.L) code. The Translator receives on the one hand, the SL text which invokes the source discource process with all its factors involved in its production and in the other hand, launches into the target discource process with the factors equivalent to those of source discource and search for appropriate TL texual Strategies for presenting his discource process."

Scanned with CamScanner

موصوف کے مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ترجمے کا مفہوم اُن کے نزدیک بھی سورس لنگویج کے متن کو ٹارگٹ لنگویج کے متن میں تبدیل کرنا ہے۔ بنیادی زبان (S.L) میں جس عمل نے ایک متن کا روپ اختیار کیا ہے اُس کو اپنے سارے انسلاکات کے ساتھ ترجمے کی زبان (T.L) میں منتقل کرنے کا نام ترجمہ ہے۔ یہاں ترجمے کا عمل اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک پہلے ترجمہ نگار اُس متن کی تمام تشکیلی منزلوں تک رسائی حاصل نہیں کر لیتا جن سے وہ متن موجودہ صورت اختیار کرنے کے لیے گزرا ہے۔ اس کامیابی کے بعد ہی وہ اپنے ترجمے کے ذریعے ایک ایسا متن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے جن میں اُن تشکیلی منزلوں کے نشانات بھی موجود ہوتے ہیں۔

اوپر پیش کیے گئے اقتباسات سے ترجمے کے بارے میں جو بنیادی باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں اُنھیں مختصراً یوں پیش کیا جا سکتا ہے:

۱- ترجمہ ایک فن ایک آرٹ ہی نہیں، یہ ایک سائنس بھی ہے۔
۲- ترجمہ ہمیشہ سے افہام و تفہیم کا ذریعہ رہا ہے۔
۳- ایک زبان کے مافی الضمیر کو دوسری زبان میں پیش کرنے کا نام ترجمہ ہے۔
۴- موضوعاتی ترسیل کے ساتھ ہی ساتھ ترجمہ تمدنی افہام و تفہیم کا کام بھی انجام دیتا ہے۔
۵- ترجمہ سورس لنگویج کے متن کے قاری کے تجربے کو ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کرتا ہے۔
۶- ترجمہ بنیادی متن کے مفہوم کے انتقال کے ساتھ ساتھ اُن تشکیلی منزلوں کی معلومات بھی ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کرتا ہے جن سے وہ ترتیب و تشکیل یا تصنیف و تالیف کے دوران گزرا ہے۔

اب آگے بڑھنے سے قبل اس بات کی مزید وضاحت ضروری دکھائی دیتی ہے کہ پیچھے جب یہ کہا گیا تھا کہ ترجمہ نگار کسی متن کو ترجمہ کرتے ہوئے ان معنوں کو منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اُس نے قاری کی حیثیت سے متعین کیے ہیں نہ کہ اُن معنوں کو جو مصنف کا منشا یا مقصد ہیں تو اس سے مراد دراصل کوئی نئی بات کہنا نہیں بلکہ ایک پرانے ہندوستانی نظریے کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ بہ ظاہر یہ نظریہ بالکل نیا نظر آتا ہے اور غور و فکر کی دعوت بھی دیتا ہے لیکن تاریخی تناظر میں اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ متن کی تفہیم کے سلسلے میں پیش کیا گیا یہ نظریہ بہت پرانا ہے اور اس کی پہلی گونج ہمیں بھرتری ہری کے ہاں سنائی دیتی ہے جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ لفظ کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے، معنی تو اُسے قاری عطا کرتا ہے۔ اسی بات کو بیسویں صدی میں

Scanned with CamScanner

دریدا نے بھی دُہرانے کی کوشش کی اور اس طرح فنِ ترجمہ نگاری میں بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوئے جن کے بارے میں بحثہ بحثی آج بھی جاری ہے۔

ہم بھرتری ہری، دریدا اور جدید ماہرینِ لسانیات کے خیالات سے اتفاق کریں یا نہ کریں پر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ترجمہ بہر حال اُسی مفہوم کو پیش کرتا ہے جو ترجمہ نگار قاری کی حیثیت سے پہلے متعین کرتا ہے، چاہے اُس کا متعین کردہ مفہوم مصنف کے مفہوم سے مطابقت رکھتا یا نہ رکھتا ہو۔ یعنی بنیادی مصنف جس نے سورس لنگویج میں لکھا ہے اور جن معنوں کی ترسیل کے لیے لکھا ہے ضروری نہیں کہ ترجمہ نگار اس کے وہی معنی متعین کرے۔ مثلاً علامہ اقبالؔ کے شعر کو لیجیے جو بھرتری ہری ہی کے خیال کو پیش کرتا ہے:

پھول کی پتّی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر

مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کوئی ترجمہ نگار اس کے سیدھے سادے معنی اس طرح متعین کر سکتا ہے کہ پھول کی پتّی سے تو ہیرے کا جگر کاٹا جا سکتا ہے پر کسی نادان شخص پر نرم و نازک کلام کا اثر نہیں ہو سکتا۔ کوئی دوسرا ترجمہ نگار اس کا مفہوم یوں پیش کر سکتا ہے: ''کیا پھول کی پتّی سے ہیرے کا جگر کٹ سکتا ہے؟ نہیں نا! جس طرح یہ ناممکن ہے اسی طرح کسی نادان شخص کو پیار و محبت سے راہِ راست پر نہیں لایا جا سکتا۔ یعنی اُسے راہِ راست پر لانے کے لیے سختی کی ضرورت ہے''۔ کوئی تیسرا ترجمہ نگار ہو سکتا ہے اس کے معنی یوں متعین کرے: ''جس طرح ہیرے کو ہیرے سے ہی کاٹا جا سکتا ہے اسی طرح نادان کو سمجھانے کے لیے خود نادان بننا پڑتا ہے''۔

علامہ اقبالؔ کا مقصد ان تین میں سے کس مفہوم کی ترسیل ہے یہ کہنا مشکل ہے۔ چناں چہ ترجمہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تینوں معنوں کو ترجمے کی صورت میں پیش کر دے۔ جب تک وہ یہ نہیں کرتا وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس صورتِ حال سے جو دقت پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی رو سے کسی بھی متن سے کوئی خاص معنی مخصوص نہیں کیے جا سکتے۔ جس طرح اس خیال کے تحت مفہوم تکثیریت کا رنگ اختیار کرتا ہے اِسی طرح ترجمہ کو بھی تکثیری روپ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ترجمہ نگار کیا لائحۂ عمل اختیار کرے؟ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اُس کا قاری بنیادی متن کو سمجھنے کے لیے ہی ترجمے کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ترجمہ نگار اُس کو کسی متن کے صرف ایک ہی معنے بتائے؟

Scanned with CamScanner

اس کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ صورتِ حال شاذ و نادر ہی پیش آتی ہے۔ غالب امکان یہ ہے کہ ننانوے فیصد صورتوں میں ترجمہ نگار بھی انھی معنوں کا ترجمہ کرتا ہے، جو مصنف کا عندیہ ہیں۔ جہاں تک اُن متنوں کا تعلق ہے جو ایک سے زیادہ معنوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اُن کا ترجمہ کرتے وقت ترجمہ نگار کو بڑی ذمے داری کا ثبوت دیتے ہوئے اُس متن کے اُن بھی معنوں کو پیش کردینا چاہیے جن کی طرف وہ متن اشارہ کرتا ہے۔ ایک اچھا ترجمہ نگار اُن سبھی معنوی امکانات کو پیش کردیتا ہے جن کا متن متقاضی ہوتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا ترجمہ تشریحی یا تکثیری ترجمے کی صورت اختیار کرتا ہے۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری نظر آتا ہے کہ یہ صورتِ حال اکثر تخلیقی متون کے ترجموں کے دوران پیش آتی ہے۔ نثرپاروں کے ترجموں کے دوران اس طرح کی صورتِ حال کے پیش آنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں۔

اوپر اقبالؔ کے جس شعر کی معنوی تکثیریت کی بات کی گئی ہے اس کا تعلق تین مختلف ترجمہ نگاروں سے ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی ایک ہی ترجمہ نگار اُن سبھی مختلف تشریحی ترجموں کی بات کرے۔ اس تشریحی تکثیریت کی بات کرتے ہوئے جناب کے. جے. پروہت اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> "Every exercise in translation is an exercise in interpretation. It may often leave the reader unsatisfied. It might also leave the translator unsatisfied too. This has often led a translator to produce more than one translation of the same piece. I could easily give the example of the same Rabiyats of Umar Khayyam or rather Fitzerad's Umar Khayyam.
>
> Prof M.T Patwardhan who was a professor of persian has to his credit two translations of Fitzgerad: "DRAKSHA Kavya" and "Madhulahari." The latter is an improvement upon the former as can be easily perceived on

Scanned with CamScanner

a closer Perusal of the two. Prof. Patwardhan not satisfied with his two translations of Fitzherald, did the third exercise of translating the Rubaiyat's from the original Perusal."

(Literary Translation)

اس کے بعد پروفیسر موصوف کے رباعیات کے تینوں ترجموں کی پہلی سطریوں پیش کرتے ہیں:

A book of verses underneath the bough, A Jug
of wine, a Loaf Bread - and thou thou
Beside me singing in the wilderness.
Oh, wilderness was paradise snow!

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

"Different rendering either by the same Translator or by different translators mainly arise out of differing interpretations or rather out of earnest-effort to bring from one language into another through close interpretations the core and Kernal of the translated peace. The close interpretation depends mainly upon, the translator's identification with the personality of the original writer."

اب جیسا کہ مصنف نے خود بھی سوال اٹھایا ہے، یہ جاننا بہت ضروری ہو جاتا ہے کہ اس طرح کی صورتِ حال میں کیا یہ بھی ترجمے مناسب اور قابلِ قبول ہو سکتے ہیں۔ جواب دیتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ ہاں یہ بھی ترجمے مناسب ہو سکتے ہیں پر ان کے معیار کا تعین مختلف پیمانوں سے کرنا ہوگا۔ ان سب کے لیے کوئی ایک ہی کسوٹی نہیں برتی جا سکتی۔

Scanned with CamScanner

کیا ترجمہ کرنا ممکن ہے؟

اس سوال کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ دیا جا سکتا ہے کہ اگر ترجمہ کرنا ممکن نہ ہوتا تو گزشتہ پانچ ہزار سال کے تحریری سفر کے دوران لاکھوں متون کے ترجمے ہرگز نہ کیے گئے ہوتے اور ایک زبان بولنے والے دوسری زبانوں کے کارناموں سے متعلق اتنی معلومات ہرگز نہ رکھتے جتنی معلومات آج انھیں حاصل ہیں۔ لیکن اس سوال کو اس طرح کے جواب سے مطمئن کرنے کی بجائے میرا خیال ہے ہمیں اُن بنیادی باتوں پر غور کرنا چاہیے جن کی ترغیب دینا دراصل اس سوال کا مقصد ہے۔

یہاں ابتداً یہ کہہ دینا بھی بے جا نہ ہو کہ ترجمہ ممکن ہے! جتنی صداقت اس جواب میں ہے اُتنی ہی صداقت اس میں بھی ہے کہ ترجمہ بنیادی متن سے پوری طرح انصاف نہیں کر سکتا۔ ترجمہ ممکن ہے یہ بات جس یقین کے ساتھ غیر ادبی تحریروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے اُس یقین کے ساتھ ادبی تحریروں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ اسی طرح ہر زبان کے کسی متن کو ہر زبان میں ترجمہ کرنا بھی شاید اتنا صحیح نہ ہو جتنا ہم اُسے سمجھتے ہیں۔ یعنی ہندی زبانوں کے کسی متن کو اردو زبان میں ترجمہ کرنا جتنا آسان ہے اُتنا آسان اُسے انگریزی، لاطینی یا افریقی زبانوں میں ترجمہ کرنا نہیں ہے۔ اس کی وجہ وہ لسانی رشتے ہیں جو زبانوں کے درمیان پہلے سے کسی ایک لسانی خاندان سے منسلک ہونے کی وجہ سے موجود ہوتے ہیں۔ انگریزی میں ایسی زبانوں کو Cognate Languages کا نام دیا جاتا ہے۔ ایک لسانی گروہ کا حصہ ہونے کی وجہ سے ایسی اصطلاحیں یا الفاظ زبان میں پہلے سے موجود ہوتے ہیں جو مفہوم کی ادائیگی میں آسانیاں پیدا کرتے ہیں۔

یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ ہم اصل (Cognate) زبانیں وہ ہوتی ہیں جو کسی ایک ہی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ جیسے ہند ایرانی، ہند آریائی یا ہند یورپین خاندانوں کی زبانیں۔ ان زبانوں کا ایک ہونے کی وجہ سے خاصا لسانی وفکری لین دین صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کے ہاں زندگی اور کائنات سے متعلق تصورات کا لین دین بھی ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر نظریات سے تعلق رکھنے والے الفاظ، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اُن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ چناں چہ اگر قطعی نہیں تو کم سے کم کام چلاؤ

Scanned with CamScanner

متبادل الفاظ و محاورے تھوڑی سی کوشش کے بعد مل جاتے ہیں جن کی وجہ سے ترجمہ کرنے میں خاصی آسانی ہوتی ہے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی تحریروں کا ترجمہ کرنا آسان ہوتا ہے جن کا مقصد معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے بہ نسبت اُن تحریروں کے جو معلومات کے ساتھ ساتھ انکشافات یا جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی کرتی ہیں یا جن کا مقصد مسرت سے بصیرت تک پہنچانا ہوتا ہے۔ معلوماتی علوم کے ترجمے میں ایک آسانی یہ بھی ہوتی ہے کہ سورس لنگویج کی کسی اصطلاح کے لیے اگر ہمیں ٹارگٹ لنگویج میں کوئی متبادل اصطلاح نہیں ملتی تو ہم بنیادی متن کی اصطلاح کو ہی اختیار کر کے اپنا کام چلا سکتے ہیں لیکن اُس تحریر کے سلسلے میں ہم ایسا نہیں کر سکتے جو ہمیں جذبات و احساسات سے متعارف کرانے یا اُن سے لطف اندوز ہونے کا موقع دینا چاہتی ہے۔

چناں چہ معلوماتی علوم کے سلسلے میں تو یہ دعوا کیا جا سکتا ہے کہ انھیں پورے اطمینان کے ساتھ ترجمہ کیا جا سکتا ہے لیکن ادبی تحریروں، جن کا مقصد مسرت سے بصیرت تک پہنچانا ہوتا ہے، اُن کا ترجمہ پوری طرح نہیں کیا جا سکتا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

"The flowering moments of mind drop half
their petals in speech and 3/4 in Translation."
(Sharing)

ادب نام ہے انکشافِ حیات کا۔ ادیب پر جب کوئی حقیقت منکشف ہوتی ہے تو وہ اُسے پوری طرح الفاظ کے قالب میں ڈھال نہیں سکتا کیوں کہ دنیا کی کوئی زبان اتنی مکمل نہیں ہے کہ وہ ادیب کے خیال کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے سکے۔ اسی لیے جاننے کے باوجود بہت کچھ اظہار پانے سے رہ جاتا ہے۔ ترجمہ تو اتنا بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا جتنا تخلیق میں منتقل ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا مناسب ہے کہ کسی تخلیق کا ترجمہ کرتے ہوئے تکمیل کا دعوا کرنا نادانی ہی نہیں چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف بھی ہے۔

ترجمہ ایک نہایت ہی مشکل فن ہے۔ ہر آدمی کے بس کی بات نہیں اس کے لیے جتنی ضرورت اس کی ہے کہ ترجمہ نگار اپنے فن سے آشنا ہو اتنی ضرورت اس کی بھی ہے کہ اُس میں اَن تھک محنت کرنے اور ہر طرح کی مشکلیں برداشت کرنے کا مادہ ہو۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر بھارت مودی اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:

"These various descriptions of translation act

show the tremendous potentiality of that act and at the same time unsurmountable difficulties that lie in that act. Whoever is ready to perform such an act is certainly jumping into the fire boldly and Kudos to the one who comes out unscathingly from it. But how many do come out?"

(Translation and untranslatability)

مجھے مودی کی اس دلیل میں بڑا وزن دکھائی دیتا ہے کہ "ترجمہ چاہے کتنا ہی مکمل کیوں نہ ہو ترجمہ نگار چاہے کتنا ہی منجھا ہوا، ماہر اور زبان پر عبور کیوں نہ رکھتا ہو متن کے اندر بہت سا مواد ایسا بھی ہوتا ہے جس کا ترجمہ ممکن نہیں ہوتا یا جو ترجمے کی گرفت میں آنے سے ہمیشہ رہ جاتا ہے۔ مودی کے الفاظ میں:

"This is a challenge and a failure a desire and a frustration because some untranslatability is bound to remain."

مکمل ترجمہ نہ ہو سکنے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں: (بنیادی متن کے تمدنی انسلاکات سے پوری طرح واقف نہ ہونا (۲) زبان سے صرف طالب علم کی حیثیت سے واقف ہونا نہ کہ اس سے اہلِ زبان کی طرح متعارف ہونا (۳) سورس لنگویج اور ٹارگٹ لنگویج کا Cognate یعنی ایک ہی خاندان سے منسلک نہ ہونا (۴) سورس لنگویج کے متن کے داخلی مفاہیم کی بجائے صرف سطحی مفاہیم تک پہنچ پانا یعنی ترجمہ نگار کا متن کے مفہوم کو نہ پا سکنا یا اُس کے غلط معنی متعین کرنا (۵) بنیادی متن کے مصنف کے تجربے جس کو اس نے متن کا روپ دیا ہے کی صحیح تنقیدی تفہیم یا تحسین نہ کر پانا (۶) بنیادی متن کے مصنف کے اسلوب نگارش کی خصوصیات سے نہ آشنا ہونا یا اس کی زندگی کے اُن حالات سے نا آشنا ہونا جنھوں نے اُس کی تحریر کو کوئی مخصوص رنگ دیا ہے (۷) ترجمہ کاری کے مقاصد سے نہ آشنا ہونا یا اسے کوئی غیر سنجیدہ عمل تصور کرنا (۸) متن خود کس طرح کے ترجمے کا متقاضی ہے اس کو نہ جان سکنا وغیرہ۔

ہر ترجمہ نگار کے لیے کم سے کم دو زبانوں سے آشنا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک وہ زبان جس سے ترجمہ کرنا ہے جس کو ماہرینِ لسانیات سورس لنگویج کہتے ہیں اور دوسری وہ جس میں ترجمہ کرنا ہے

Scanned with CamScanner

یعنی ٹارگٹ لنگویج۔ ان دو زبانوں میں ایک مادری زبان ہوسکتی ہے اور دوسری اکتسابی۔ یہ کوئی حتمی ضابطہ نہیں کیوں کہ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ سورس اور ٹارگٹ دونوں اکتسابی زبانیں ہوتی ہیں۔ یہاں میرا مقصد صرف اس بات پر زور دینا ہے کہ پہلی صورتِ حال ترجمہ کار کے لیے زیادہ سودمند ہی نہیں بہتر نتائج کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ اس میں بھی زیادہ بہتر نتائج اُس وقت سامنے آسکتے ہیں جب وہ اپنی مادری زبان میں لکھی کسی تحریر کو اکتسابی زبان میں ترجمہ کرے کیوں کہ کسی تحریر کو ترجمہ کرنے سے پہلے اُسے پوری طرح سمجھنا ضروری ہے۔ مفہوم کو پوری طرح پالینے کے بعد اُسے اکتسابی زبان میں منتقل کرنا ترجمہ کار کے لیے آسان ہوجاتا ہے چاہے اُس پر اُسے ماہرانہ گرفت نہ بھی حاصل ہو یا اُس حد تک عبور حاصل نہ ہو جس حد تک اُسے اپنی مادری زبان پر عبور حاصل ہے۔ یہاں میرا مقصد یہ کہنا ہرگز نہیں ہے کہ ٹارگٹ لنگویج یا جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اور جو اکتسابی زبان ہے اُس پر عبور حاصل نہیں کیا جاسکتا ضرور کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ عبور اُس حد تک نہیں پہنچ سکتا جس حد تک مادری زبان پر ہمیں عبور حاصل ہوتا ہے۔ ایک آدھ درجے کی کمی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس کی بہترین مثال رابندر ناتھ ٹیگور کی گیتانجلی کا وہ ترجمہ ہے جو انھوں نے خود انگریزی زبان میں کیا اور جس پر انھیں نوبل انعام دیا گیا۔ بنگالی زبان کے بنیادی متن اور انگریزی کے ترجمے کا موازنہ کیجیے تو میری دلیل میں آپ کو کچھ نہ کچھ وزن ضرور محسوس ہوگا۔

کسی صحافتی، دفتری، سائنسی یا روزمرہ زندگی میں کام آنے والی دستاویز یا تحریر کا ترجمہ کرنا شاید اُتنا مشکل نہ ہو جتنا مشکل کسی تخلیقی فن پارے کا ترجمہ کرنا ہے اس میں سب سے پہلی دقت تو اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ ادبی فن پارہ دنیا کیا اور کیسی ہے، اس کی بات نہیں کرتا بلکہ وہ کیا ہوسکتی ہے یا کیا ہونی چاہیے اُسے پیش کرتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے تو ترجمہ کار کو فن کار کے اُن محسوسات تک رسائی حاصل کرنا پڑتی ہے جن کی وجہ سے اُس فن پارے میں کسی مخصوص دنیا کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ کام بہت مشکل ہے اور اس میں کامیابی اُس ترجمہ کار کو حاصل ہوتی ہے جو ترجمہ کار ہونے کے ساتھ ساتھ تخلیقی جوہر سے بھی مزین ہو اور زبان کے اُس برتاؤ کی نبض پہچانتا ہو جو اُس فن پارے میں موجود ہے۔ ادیب فن پارے کی تخلیق کے دوران زبان کو غیر روایتی انداز و اسلوب میں برتتا ہے۔ الفاظ کی گروہ بندی سے عجیب عجیب طرح کی اصطلاحیں، پیکر، استعارے اور تشبیہیں تراشتا ہے جو اُس کے محسوسات کو اپنے اندر سمو کر قاری تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترجمہ نگار اگر ادیب کے اس لسانی برتاؤ سے آشنا نہیں ہے تو وہ

Scanned with CamScanner

اُس کے مفہوم یا مفاہیم تک رسائی حاصل کر ہی نہیں سکتا۔ اور اگر مفاہیم تک رسائی حاصل نہیں ہوتی تو ترجمہ کاری کا مرحلہ طے ہی نہیں ہو سکتا۔ ہر فن پارے کے کچھ حصے کا ترجمہ نہ ہو سکنے کی جو بات اوپر کی گئی ہے اُس کا زیادہ تر سامنا ترجمہ کار کو ادبی فن پاروں کے ترجمے کے دوران ہی کرنا پڑتا ہے۔

دوسری دقت ادیب کے اپنے اظہار کو علائم کی مدد سے ڈھک چھپا کر پیش کرنے کی کوشش کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اچھا تخلیقی فن پارہ ہمیشہ ایک دھندلکے کی صورت رکھتا ہے۔ جیسے کوئی ہونٹ کاٹتے ہوئے بات کر رہا ہو۔ اُس میں ادیب جو کچھ کہتا ہے اُس سے کہیں زیادہ کہنے سے رہ جاتا ہے یا اشاروں کی صورت میں سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے فن پارے میں بہت سے خوانچے ایسے ہوتے ہیں جنھیں پُر کیے بغیر نہ تو اُسے سمجھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ شاعری میں ان کو مقدرات کے نام سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ان مقدرات کو پُر کرنا قاری کا کام ہے جو ظاہر ہے کہ کسی عام قسم کے قاری کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ سب کچھ اگر کامیابی کے ساتھ کر بھی لیا جائے پھر بھی ضروری نہیں کہ اُسے ترجمے کی شکل دی جا سکے۔ پھر بھی میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ کسی تخلیقی فن پارے کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا یا اس کا ترجمہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں تو صرف اُن دقتوں کو ذہن میں رکھنے کا مشورہ دے رہا ہوں جو ترجمہ کار کے راستے میں آ سکتی ہیں۔ اگر ہمارے ترجمہ کاروں نے دقتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہوتے تو دنیا اُن فن پاروں کے مطالعے سے محروم رہ جاتی جسے دنیا کے عظیم سرمائے میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لیے جتنی صداقت اس بات میں ہے کہ شاعری یا تخلیقی ادب کا ترجمہ ایک مشکل کام ہے یا یہ کہ ہر ترجمے میں بہت سا حصہ ترجمے کی شکل اختیار کرنے سے رہ جاتا ہے اتنی ہی سچائی اس بات میں بھی ہے کہ دنیا کی کوئی تحریر ایسی نہیں جس کا ترجمہ نہ کیا جا سکے چاہے وہ ترجمہ کتنا ہی نامکمل یا یک طرفہ ہی کیوں نہ ہو۔ موڈی کے الفاظ میں:

> "Accepting that untranslatability remains is not a defeat. In fact it is one of the assets of the translator."

یہی وہ حقیقت ہے جو ہمیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ ترجمہ نگار کا کام بنیادی متن کے ہر لفظ کو ٹارگٹ لنگویج کے متبادل لفظ سے بدلنا نہیں ہے۔ اگر یہی اُس کا کام ہوتا تو ترجمہ سرے سے ہو ہی نہیں سکتا۔ اُس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ چناں چہ اُس کا کام مصنف کے عندیے تک پہنچانا

Scanned with CamScanner

ہے جس کے لیے اُسے بہت سے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔ بہت سے حصے چھوڑنے پڑتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ مجموعی مفہوم کو گرفت میں لا کر فن پارے کو سمجھنے میں قاری کی مدد کرتا ہے۔ سورس لنگویج کے جن الفاظ کے متبادل ٹارگٹ لنگویج میں نہیں ملتے انھیں یا تو چھوڑ دیتا ہے یا پھر اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کے متبادل تراشتا ہے۔ مثلاً انگریزی زبان میں 'باغ باغ ہونا' کے لیے کوئی متبادل نہیں ہے چناں چہ ترجمہ کار کو سمجھوتہ کرتے ہوئے Feeling pleased, Over joyed, Extremely happy کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ترجمہ نگار کو اگر اتنی آزادی نہیں دی جاتی تو اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا۔ اُسے ہمیشہ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے:

"Not to translate would be criminal and to translate badly is a guilt."

ترجمہ کس طرح کیا جائے اس کے لیے کوئی حتمی ضوابط تو متعین نہیں کیے جا سکتے کیوں کہ اس عمل سے گزرتے ہوئے بہت کچھ ترجمہ نگار کی صواب دید پر منحصر ہوتا ہے لیکن ایک نو آموز کی رہبری کے لیے کچھ نہ کچھ خاکہ تیار کرنا ضروری ہے۔ اس لیے اب نیچے اُن چند ضوابط کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے شناسائی حاصل کرنا ہر نو آموز کے لیے ضروری ہے۔

ترجمے کے اصول

ترجمہ ایک بہت ہی مشکل فن ہے۔ اس میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اگر چہ ترجمے سے ذہنی مناسبت بہت ضروری ہے اس کے باوجود کچھ اصول وضوابط ایسے بھی ہیں جن سے کماحقہ واقفیت کے بغیر ذہنی مناسبت بھی وہ نتائج حاصل نہیں کر سکتی جو اس فن کا تقاضا ہے۔ اسی لیے یہاں اُن بنیادی تقاضوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو کسی ترجمہ کار کو اپنے مقاصد تک پہنچا سکتے ہیں۔

ا- مفہوم کی ترسیل

کوئی بھی ترجمہ نگار اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ ترجمے کا بنیادی مقصد اُس مفہوم کی ترسیل ہے جو بنیادی متن کے ذریعے کسی مصنف نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس زبان میں لکھے گئے کسی فن پارے یا تحریر کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے اس کا مفہوم اگر ٹارگٹ لنگویج

Scanned with CamScanner

میں منتقل نہیں ہو پایا ہے یا ہو پا رہا ہے تو یہ ترجمہ بے کار ہے۔ اس لیے ترجمہ نگار کا بنیادی کام اُس مفہوم کو ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کرنا ہے جو سورس لنگویج کی کسی تحریر میں قید ہے۔ مفہوم کی حد تک نہ تو ترجمہ نگار کو کچھ اضافہ کرنا چاہیے نہ کم۔ مفہوم کو بے کم و کاست پیش کرنا چاہیے۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے کچھ اور باتوں کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ مفہوم کو بے کم و کاست پیش کرنے کے معنی متن کے اُن معنوی امکانات سے چشم پوشی کرنا نہیں ہے جو متن کی نچلی سطحوں میں تہ نشیں ہوتے ہیں یا وہ معنی جن کی طرف بھی متن اشارہ کرتا نظر آتا ہے۔

۲- ہیئت

ترجمے میں الفاظ اور خیالات کی ترتیب جہاں تک ممکن ہو بالکل ویسی ہی ہونی چاہیے جیسی بنیادی متن، جس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے، میں ہے۔ دفتری مراسلوں، قانونی دستاویزات، مچلکوں، ضمانتوں اور معاہدوں کے ترجمے کے سلسلے میں تو یہ بنیادی شرط کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر زبان کی لسانی مجبوریوں کی وجہ سے کہیں نہ کہیں ہیئت اور الفاظ کی ترتیب میں تبدیلی لانا ضروری ہو جاتا ہے۔ تاہم متن میں اُن الفاظ کو خط کشید کر دینا ضروری ہے جن کے ترجمے سے متعلق کسی طرح کا شک وشبہ پیدا ہو گیا ہو۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے نیچے کچھ نمونے پیش کیے جا رہے ہیں:

1. 'Cape Wrath doesn't mean "angry" ',Mr Mathers said 'It's from a Norse word that means "turning-point". This is where the ships turned south.'
   (Paul Theroux: The Kingdom by the Sea)
2. When do you open your Chrismas presents?
   Open them only in the privacy of your own family. Do remember to leave the receipts in 'by mistake', then everyone can change everything next week.
   (SHE magazine)
3. A good actor cannot merely imagine a given situation but can 'feel' what it would be like in

Scanned with CamScanner

such a situation. Art without feeling is dead.
(C.J. Adcock: Fundamentals of Psychology)

4. Well into this century it was usual for 'free' patients at the big hospitals to have their teeth extracted with no anaesthetic. They didn't pay, so why should they have an anaesthetic- that was the attitude.
(George Orwell: Collected Essays)

5. (From a report on the opening of a new Civic Hall) When the word 'civic' was revived in the nineteenth century it got off to a bad start. Intented to inspire memories of the Roman Republic, it in fact came to mean 'pompous', 'small-minded' and 'parochial'. A building of this sort (the new Civic Hall) should help to set the word off on a new and more hopeful tack.
(Architectural Review)

6. In West Germany, researchers have implanted artificial bone, made from the tiny skeletons of algae, into the jaws of laboratory animals. They say that algal 'bone' behaves better than the synthetic material surgeons currently use to mend damage to bone tissue in humans.
(New Scientist)

اوپر پیش کیے سبھی اقتباسات میں کچھ الفاظ نمایاں کیے گئے ہیں۔ ترجمہ نگار کا کام یہ جاننا ہے کہ بنیادی مصنف نے ایسا کیوں کیا ہے۔ کیا یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اِن الفاظ کے ایک سے زیادہ معنی ہیں یا اس لیے کہ مصنف اُن کے مفاہیم پر زیادہ زور دینا چاہتا ہے یا وہ اپنے سیاق میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ جب تک ترجمہ کار یہ نہیں جانتا اُس کا ترجمہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ ترجمہ کرتے وقت ضروری ہے کہ وہ انگریزی کے متن میں اُن الفاظ کو اسی طرح خط کشید کر دے جیسے یہاں کیا گیا ہے تا کہ قاری یہ سمجھ جائے کہ ترجمہ نگار نے متذکرہ الفاظ کے جو معنی

Scanned with CamScanner

متعین کیے ہیں اُن سے الگ بھی اُن کے معنی ہو سکتے ہیں۔ نمونے کے طور پر اوپر پیش کیے گئے پیرا نمبر 3 کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے تا کہ معنوی امکانات کی کچھ بات واضح ہو سکے:

> ''ایک اچھا اداکار کسی صورتِ حال کے بارے میں محض سوچتا نہیں بلکہ اُسے محسوس کر سکتا ہے یعنی وہ یہ محسوس کر سکتا ہے کہ اُس طرح کی صورتِ حال میں گرفتار ہونا کیا ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ سچ مچ اُس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہوتا تو اس پر کیا بیتتی، فن محسوسات کے بغیر بے جان ہے''۔

مندرجہ بالا پیرے میں what it would be like in such a situation ایک ایسا جملہ ہے جس کے مختلف معنی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً:

۱- اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہونا کیسا ہوگا۔
۲- میں خود اس طرح کی صورتِ حال سے دوچار ہوتا تو کیا محسوس کرتا۔
۳- اس طرح کی صورتِ حال میں مجھ پر کیا بیتتی۔

مغربی جرمنی کے سائنس دانوں نے بغیر جڑوں والے پانی پر تیرنے والے پودوں، جنھیں ایلجائے کہا جاتا ہے، کے نازک پنجروں سے تیار کردہ مصنوعی ہڈی لیبارٹری کے جانوروں کے جبڑوں میں لگائی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ایلجائی سے تیار کردہ یہ ہڈی اس مصنوعی مواد سے بہتر عمل یا کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے جو آج کل سرجن انسانوں میں ہڈی کے خلیے کی مرمت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس اقتباس کا پہلا جملہ ہی اس قدر مبہم ہے کہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے غلطی ہو جانے کا امکان ہے یا کوئی اور ترجمہ نگار اُس کے الگ معنی لیتے ہوئے اُسے اور طرح سے ترجمہ کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ اس کے معنی یہ لے سکتا ہے:

مصنفِ متن دراصل کہنا یہ چاہتا ہے کہ مغربی جرمنی کے سائنس دانوں نے ایلجائی سے تیار کردہ ہڈی کو تجربہ گاہ کے جانوروں کے جبڑوں میں نصب کر کے اُس کی کارکردگی کا جائزہ لے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ ہڈی انسانی ہڈی کے خلیے کی مرمت کے لیے اُس مصنوعی مواد سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے جو آج کل ہمارے سرجن اس مقصد کے لیے استعمال کرتے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ لیکن پہلے جملے کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ مصنف کی منشا تک پہنچنے میں قدرے دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر جملہ یوں ہوتا تو کوئی دقت نہ ہوتی:

In West Germany, Researchers have implated artificial bone into the jaws of laboratory animals.

آیئے اب کچھ ایسے اقتباسات دیکھتے ہیں جن میں کچھ الفاظ پر زور دیا گیا ہے۔ الفاظ پر دیے گئے زور کو ظاہر کرنے کے لیے انھیں یا تو باریک لکھا گیا ہے یا ستارہ ڈال کر نمایاں کیا گیا ہے:

1. Travelling by bus does have some compensations.It may be dusty and very, very uncomfortable. One may see only a small part of the countryside through the dirty windows, but bus travel is comparatively cheap and one does meet people. Indeed, no one can escape, yourself included. Everyone is united by discomfort and the excitement of the journey.
   (Tim Severin: Tracking Marco Polo)
2. 'I' m very ambitious!' she at last replied.
   'And your ambitions have not been satisfied? They must have been great.'
   'They were (*) great. I should make myself ridiculous by talking about them.'
   (Henry James: Portrait of a Lady)
3. 'Mrs Moore, what is this echo?'
   'Don't you know?'
   'No - what is it? Oh, do say! (*) I felt you would be able to explain it.'
   'If you don't know, you don't know; I can't tell you.'
   (E.M. Forster: A Passage to India)

Scanned with CamScanner

4. No one supposes that housing estates are places where men work.

   Women, however, do work there, and for some full-time housewives it is their main place of work.

   (Ronald Frankenberg: Communities in Britain)

5. 'Have you been long in Bath, madam?'

   'About a week, sir,'replied Catherine, trying not to laugh.

   'Really!' with affected astonishment.

   'Why should you be surprised, sir?'

   'Why, indeed! said he in his natural tone; 'But some emotion must appear to be raised by your reply.'

   (Jane Austen: Northanger Abbey)

6. Are we to assume that evolution has produced in the heads of chimpanzees brains whose power far outstrips the use to which they are put? That indeed would be a waste, and indeed it would be uncharacteristic of the usually economic forces of evolution.

   (Richard Leakey and Roger Lewin: People of the Lake)

آگے بڑھنے سے پیشتر آیئے پہلے ایک اقتباس کا ترجمہ کر لیتے ہیں:

"ا- بس سے سفر کرنے سے یقیناً کچھ تلافی بھی ہوتی ہے، چاہے وہ گرد آلود اور بہت تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہو۔ بس کی گرد سے اٹی کھڑکیوں سے چاہے کوئی دیہات کا (مضافات کا) بہت تھوڑا سا ہی حصہ کیوں نہ دیکھ پائے لیکن بس کا سفر مقابلتاً سستا ہوتا ہے اور پھر یہ کہ لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ اس سے بہ شمول آپ کے کسی کو مفر نہیں۔ سفر کی

Scanned with CamScanner

بے آرامی اور جوش سب کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے''۔

اس اقتباس میں جن جملوں پر زور دیا گیا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- بس سے سفر کرنے میں کچھ تلافی بھی ہوتی ہے۔

۲- پھر لوگوں سے ملاقات بھی ہوتی ہے۔ اس سے کسی کو مفر نہیں۔

پہلے جملے میں مصنف جب یہ کہتا ہے کہ بس سے سفر کرنے سے کچھ تلافی بھی ہوتی ہے تو دراصل وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بس سے سفر کرنے سے اگر چہ پریشانی اور بے آرامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن کچھ فائدہ بھی ہوتا ہے جو پریشانی اور بے آرامی کی تلافی کر دیتا ہے۔ یہ تلافی دو طرح سے ہوتی ہے ایک سفر کے سستا ہونے کی صورت میں اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کی صورت میں۔ یہی دو پہلو ایسے ہیں جن پر مصنف زور ڈال رہا ہے۔ اس لیے ترجمہ کرتے وقت ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کرنا ضروری ہے۔ یہ کام اُسی صورت میں ہوسکتا ہے جب ترجمے کی جملوی ترتیب میں تھوڑا سا ردوبدل کیا جائے۔ چناں چہ اب ترجمے کی شکل کچھ یوں ترتیب پائے گی:

۲-''بس کا سفر چاہے گرد آلود اور بہت ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو اور گرد سے اٹی ہوئی بس کی کھڑکیوں سے چاہے ہمیں مضافات کا نظارہ کرنے کا پورا موقع نہ ملے پھر بھی بس کا سفر مقابلۃً سستا ہوتا ہے اور طرح طرح کے لوگوں سے ملاقات ہونے کی وجہ سے یقیناً کچھ تلافی بھی ہو جاتی ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ سفر کی بے آرامی اور جوش ہم سب کے حصے میں برابر آنے کی وجہ سے ہم میں اتحاد پیدا کر دیتا ہے''۔

۳- مصنف کی منشا کا احترام

زبانیں تکلفات کو برتنے کے سلسلے میں ایک دوسرے سے خاصا اختلاف رکھتی ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ ترجمہ نگار کسی تحریر کا ترجمہ کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ مصنف کا منشا کیا ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ترجمہ نگار کو پُر تکلف یا مخصوص یا ذاتی اظہار میں تمیز کرنی چاہیے جس کے تحت اس کے مصنف نے کوئی مخصوص لب ولہجہ اختیار کیا ہوتا ہے۔ مثلاً اُسے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر دیے گئے اقتباس کا لفظی ترجمہ کیا جائے تو اس کا اظہار کیا بہت ہی پُر تکلف / بے تکلفانہ، سرد / پُر جوش، نجی / غیر ذاتی ہو جائے گا۔ ادیب کی منشا کیا ہے (وہ قائل کرنا چاہتا ہے / باز رکھنا

Scanned with CamScanner

چاہتا ہے، معافی مانگنا چاہتا ہے/نکتہ چینی کرنا چاہتا ہے وغیرہ)۔ کیا یہ سب پہلو ترجمے میں نمایاں ہو پا رہے ہیں۔

۴- بنیادی زبان کا اثر

ترجمہ پر زیادہ تر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ اس کا غیر فطری ہونا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترجمہ نگار کے خیالات اور اس کے الفاظ کے انتخاب پر سب سے زیادہ اثر بنیادی متن کا ہوتا ہے۔ اس اثر سے نجات حاصل کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بنیادی زبان کے متن کو ایک طرف اٹھا کے رکھ دیجیے اور یادداشت کی مدد سے کچھ جملوں کا زور سے بولتے ہوئے زبانی ترجمہ کیجیے۔ اس سے آپ کی زبان میں خیالات کے اظہار کا فطری اسلوب جنم لے گا جو شاید اُس وقت آپ کے ذہن میں نہ آسکے جب آپ کی نظر سورس لنگویج کے بنیادی متن پر لگی ہوئی ہو۔

۵- اسلوب اور شفافیت

ترجمہ نگار کو بنیادی متن کے اسلوب کو بدلنا نہیں چاہیے لیکن اگر متن میں پھسلن ہے یا مشکل تکرار سے اٹی ہوئی ہے تو ترجمہ نگار قاری کی خاطر اس کی خامیوں کی تصحیح کر سکتا ہے۔

٦- محاورہ

محاورے پر مبنی اظہار ترجمے کی گرفت میں نہیں آتے۔ ان میں تشبیہیں، استعارے، ضرب الامثال، اقوال، غلط سلط بولی، عامیانہ زبان اور Colloqialism یا ....P شامل ہیں۔ اگر اس طرح کے اظہارات کا براہِ راست ترجمہ نہ ہو سکے تو حسبِ ذیل طریقے استعمال کیجیے:

۱- بنیادی لفظ کو کاموں میں رکھ کر ترجمے میں برت لیجیے۔
۲- بنیادی اظہار کو باقی رکھیے، لفظی ترجمہ قوسین میں دے دیجیے۔
۳- قریبی مترادفات کو برت لیجیے۔
۴- کوئی غیر محاوراتی یا سادہ نثری ترجمہ برت لیجیے

اس کا بہترین اصول یہ ہے کہ جو محاورہ آپ کی زبان میں کام نہیں آسکتا اُسے ترجمہ نہ کیجیے۔

Scanned with CamScanner

(نوٹ: مندرجہ بالا سارے ضوابط ایلن ڈف کی کتاب ٹرانسلیشن سے لیے گئے ہیں جو مولف نے خود بھی Frederick Fuller کی کتاب The Translator's Handbook سے نقل کیے ہیں)۔

ترجمے کے مقاصد

ترجمے کے مقاصد پر اگرچہ اس سے پہلے بھی کچھ حد تک روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہاں اُن تمام اقسام کا تفصیل سے ذکر کرنے کی ضرورت ہے جو مختلف مقاصد کے حصول کے لیے وقتاً فوقتاً وجود میں آئی ہیں۔

پروفیسر محمد حسن ترجمے کے مقاصد سے بحث کرتے ہوئے اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر ترجمہ لسانی اور تہذیبی مفاہمہ ہے جو نہ اصل کی لذت کو پوری طرح پاسکتا ہے نہ اُس سے مکمل طور پر محرومی کو قبول کرتا ہے''[1]

اس مقالے میں آگے چل کر اپنے عندیے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر کسی ترجمے کے تین مقاصد ممکن ہیں، پہلا معلوماتی، دوسرا تہذیبی، تیسرا جمالیاتی۔ الفاظ مختلف قسم کی اقدار کی ترسیل کرتے ہیں۔ ترسیل کی مختلف سطحیں ہیں۔ سب سے اوپری اور کسی قدر آسان سطح معلوماتی ہے۔ مترجم کا بنیادی مقصد نئی زبان کی وساطت سے معلومات کی ترسیل ہے یہاں ترجمہ جتنا اصل سے قریب ہوگا معلومات کی ترسیل کا حق اتنا ہی بہتر طور پر ادا ہو سکے گا۔ اس ضمن میں سائنسی علوم کے ترجمے آئیں گے۔ یہاں ترجمے کی کامیابی اس پر منحصر ہوگی کہ کتنے شفاف طور پر اصل کی معلومات ترجمے کے ذریعے دوسری لسانی برادری کے سامنے آئیں..........۔
>
> دوسری سطح ہے تہذیبی۔ جہاں ایک تہذیب کے تصورات دوسری تہذیب کے پیکر میں ڈالنے ہوتے ہیں۔ اصل میں مترجم کا کام ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھنا نہیں ہے، ایک تہذیبی معنویت کو دوسری تہذیبی معنویت

Scanned with CamScanner

میں ڈھالنا ہے۔ تہذیب اقدار کو جنم دیتی ہے اور اقدار سے بنتی اور سنورتی ہے اور اُنھیں کے بل بوتے پر پوری لسانی آبادی کا ردِ عمل متعین ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک تہذیب میں ایک مخصوص لفظ تصورات کا آئینہ خانہ ہو لیکن وہی تصور جب دوسری زبان کے لفظ میں ادا ہو تو دوسرے تہذیبی سیاق میں مہمل یا بے معنی ہو جائے۔

تیسری سطح جمالیاتی ہے اور غالباً سب سے زیادہ دشوار ہے۔ جمالیاتی انبساط خود نہایت پیچیدہ ہے۔ دوسرے یہ عمل الفاظ کے سطحی معنوں کے بجائے اُن کے متنوع متعلقات کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ الفاظ صرف معلومات یا محض تصورات پیش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص فضا اور کیفیت چھوڑتے گزر جاتے ہیں'' ۔۲

گزشتہ صفحات میں جناب کرشنا مورتی کے حوالے سے ترجمے کے جو دو مقاصد بیان کیے گئے ہیں انھیں یہاں ایک بار پھر دُہرانے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ موصوف لکھتے ہیں:

''ترجمہ دو مقاصد حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے (۱) ایک زبان کی کسی عبارت کو کسی دوسری زبان میں بالکل ویسی ہی شکل دینا یعنی جو مفہوم بنیادی زبان کے متن کا ہے وہی مفہوم دوسری زبان کے الفاظ کے ذریعے اس میں منتقل ہو یا پھر (۲) اس کے ذریعے تمدنی افہام و تفہیم کے مرحلے طے کیے جائیں''۔

یوں تو ترجمے سے کچھ اور مقاصد بھی وابستہ کیے گئے ہیں لیکن غور سے اگر دیکھا جائے تو اس کے وہی تین بنیادی مقاصد طے پاتے ہیں جن کا ذکر پروفیسر محمد حسن نے کیا ہے یعنی (۱) معلوماتی (۲) تہذیبی اور (۳) جمالیاتی۔

آیئے اب ذرا اس بات کا بھی جائزہ لے لیا جائے کہ کیا قرار واقعی ترجمہ ان تین مقاصد کو بحسن و خوبی انجام دیتا بھی ہے یا نہیں؟ تاریخ شاہد ہے کہ ترجمے نے عالمی سطح پر افہام و تفہیم کے ساتھ ہی ساتھ ایک قوم کو دوسری قوم کے احساسات و مدرکات، جذبات و احساسات، اقدار و اعتقادات اور علوم و فنون میں حاصل کامیابیوں و کامرانیوں سے روشناس کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے اُس سے انکار ممکن نہیں۔ ایک عرصے تک علم حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تراجم کو

Scanned with CamScanner

ہی تصور کیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ دنیا کی جتنی بھی بڑی عالمی تہذیبیں وجود میں آئیں انھوں نے دوسری اقوام کے ادبی وعلمی سرمائے کو اپنی زبان میں محفوظ کرنے کے لیے باقاعدہ شعبے قائم کر کے کام کرایا۔ سمیریائی، مصری، یونانی اور سندھ کی تہذیبوں کے زمانے میں یہ کام خاص طور سے کیا گیا۔

ان تراجم نے معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ تہذیبی لین دین کے لیے بھی زمین ہموار کی یعنی ایک تہذیب کے افکار ونظریات کو دوسری تہذیب کے افکار ونظریات سے ہم آمیز کر کے انسانی تہذیب کا ایک آفاقی منظر نامہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ آج ہم دنیا کو جو ایک گاؤں تصور کرتے ہیں اس کو ممکن بنانے میں تہذیبی ترجمے نے بھی قابلِ قدر کردار ادا کیا ہے۔

ترجمے کے جمالیاتی مقاصد کی عمل آوری ایک مشکل امر ہے۔ اسے فن کار یا ترجمہ نگار دو طرح سے حاصل کرتا ہے (۱) ترجمے کو اصل سے قریب تر کر کے اور (۲) اس کے لیے کوئی ایسا لسانی پیرہن تراش کر کے جو اپنے اندر حسن کی بے پناہ دولت لیے ہوئے ہو۔ متن کے معنوں کی بے کم وکاست ترسیل بذاتِ خود ایک جمالیاتی تجربہ ہے۔ اسی طرح تکمیل کا احساس بذاتِ خود حسن کا منبع ہے۔ ان دونوں عوامل کو کسی ملمعے یا لیبل کی ضرورت نہیں۔ جس طرح کوئی اظہار جب مکمل ہو جاتا ہے تو پھر اُسے موثر بنانے کے لیے تزئین کاری یا صنعت کاری کے کسی ہنر کی ضرورت نہیں رہتی اسی طرح کسی اظہار کو جب ہم کسی دوسری زبان میں اطمینان کی حد تک منتقل کر دیتے ہیں تو یہ عمل خود اپنی ذات میں حسین بھی ہو جاتا ہے۔ حسن کاری کے لیے اب اُسے کسی کرافٹ یا دستکاری کی ضرورت نہیں رہتی۔

ترجمے کے نظریات

ترجمے کے فن سے متعلق قدیم زمانے ہی سے غور وخوض ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ آج محض ایک فنی سرگرمی نہیں بلکہ فلسفے کے ایک شعبے کا درجہ حاصل کر گیا ہے۔ اور اس سے متعلق بحث بحثی نے ایسے ایسے فلسفیانہ نکات کو سامنے لایا ہے جنھیں دیکھ کر حیرت ہی نہیں مسرت بھی ہوتی ہے۔ گزشتہ پانچ ہزار سال کے دوران ترجمے کے مسائل سے متعلق غور وخوض نے جن نظریات کو جنم دیا ہے انھیں مختصراً اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے:

Scanned with CamScanner

۱- قدیم ویدک نظریہ

ترجمے سے متعلق نمودار ہونے والے نظریات میں سب سے قدیم نظریہ وہ ہے جو ویدک دور میں پروان چڑھا اور جس کی ابتدائی صورت ہمیں سنسکرت کے قدیم ادب میں نظر آتی ہے۔ یاد رہے قدیم ویدک زمانے میں علم لسان اور علم معنی سے متعلق جو افکار و نظریات سامنے آئے اُن کا مقصد لفظ کے ارتقائی معنوں کی ترسیل پر زور دینا تھا۔ یعنی لفظ اپنے ارتقا کے سفر کے دوران جو معنویاتی جہتیں اختیار کرتا انھیں کو سامنے رکھ کر اُس کے معنی متعین کیے جاتے۔ لیکن بھرتری ہری نے لفظ سے متعلق اس بحث کو اُس وقت نیا موڑ دیا جب انھوں نے اس انکشافاتی نظریے کو پیش کرتے ہوئے یہ کہا کہ لفظ اپنی ذات میں کوئی معنی نہیں رکھتا، اس کا استعمال اور جس سیاق و سباق میں وہ برتا جاتا ہے وہ اُسے معنی عطا کرتا ہے۔

بھرتری ہری کا یہ کہنا علم اور فلسفے کی دنیا میں کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ چناں چہ لفظ سے متعلق بھرتری ہری کے اس نظریے نے ترجمے کے سلسلے میں بھی ایک منفرد نظریے کو جنم دیا۔ یہی نہیں لسانیاتی سطح پر بھی ان کے اس قول نے ایک آفاقی زبان کے تصور کو ابھارنے کا کام کیا جس نے بالآخر ترجمے کی سرگرمیوں کے لیے بھی نئے امکانات روشن کیے۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ بھرتری ہری زبان کے اندرونی ڈھانچے کو ہی دراصل آفاقی زبان قرار دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں بظاہر ہم کو جو فرق نظر آتا ہے وہ صرف بیرونی ڈھانچے کا فرق ہے۔ اس اعتبار سے ترجمے کا مطلب بیرونی ساخت سے آگے جانا ہے اور اندرونی مشابہتوں پر غور کرنا ہے۔ بھرتری ہری کا یہ نظریہ چومسکی اور دیرن دیور کے جدید نظریۂ لسان سے بھی قریب تر ہے، جس سے ترجمے کو نئے آفاق تک رسائی حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔

اس نظریے سے ترجمے سے متعلق جو اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ترجمے کا مطلب سورس لنگویج کے متن کے الفاظ کے سامنے ٹارگٹ لنگویج کے متبادل الفاظ رکھنا نہیں بلکہ الفاظ کی تہ میں موجود جو معنویاتی جہتیں ہیں انھیں ترجمے کی صورت میں ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کرنا ہے۔

۲- نظریۂ مطابقت (Equivalence Theory of Translation)

Scanned with CamScanner

اس نظریے کو جرمنی کے ایک اسکول نے ۱۹۶۰ء کے آس پاس شروع کیا جس کا سب سے بڑا مبلغ آٹو کیڈ (Otto Kade) تھا۔ اس نے اپنے نظریۂ مساویت و مطابقت کو چار اقسام میں منقسم کرکے اُسے مزید واضح کرنے کی کوشش کی جنھیں ہم کچھ اس طرح سے پیش کر سکتے ہیں:

(الف) ترجمے میں مساویت یا مطابقت کی پہلی قسم کو اس نے کلی مطابقت کا نام دیا یعنی ایسی مطابقت جسے اس کی زبان میں (one-to-one) مطابقت قرار دے سکتے ہیں جو صرف ایسی اصطلاحوں سے ہی ممکن ہے جو ہو بہو معنوں کی ترسیل کو ممکن بناتی ہوں۔ جیسے امیج کو ہم پیکر کہہ سکتے ہیں۔

(ب) مطابقت کی دوسری قسم کو ہم ایک کے مقابلے میں بہت سی مطابقتوں کا ہونا کہہ سکتے ہیں جس کو اس نے one-to-many کہہ کر پکارا ہے۔ جیسے انگریزی کے لفظ Suspense کے مقابلے میں Tension, Pressure, Stress وغیرہ۔

(ج) تیسری کو وہ ایک کے مقابلے میں ایک کے کسی حصے یعنی one-to- part of one correspondence کا نام دیتا ہے یعنی تقریباً برابر۔ جیسے انگریزی کے الفاظ Heaven اور Sky۔

(د) مطابقت کی چوتھی اور آخری قسم کو وہ ایک کے مقابلے میں کوئی نہیں کا نام دیتا ہے جسے انگریزی میں وہ one-to-None correspondence کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ اُن الفاظ میں ملتی ہے جن میں تمدنی انسلاکات ہوتے ہیں۔

غور سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سبھی اقسام کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے یعنی بنیادی متن کے الفاظ کو ترجمے کی زبان کے متبادل الفاظ فراہم کرنا۔ یہ کام چاہے ایک کے سامنے ایک متبادل لفظ، ایک کے سامنے بہت سے متبادل الفاظ، ایک کے سامنے ایک متبادل لفظ کا کوئی حصہ رکھ کے یا ایک کے سامنے کوئی متبادل لفظ نہ رکھ کے کیا جائے، بات ایک ہی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رکھیے کہ متبادل لفظ یا الفاظ رکھنے کے معنی ایسے الفاظ سے ہیں جو بنیادی متن کے مفہوم کی ترسیل کا حق ادا کرتے ہوں۔ یہاں مشابہت لفظ کی شکل یا ساخت سے نہیں اُس کے معنی سے ہونا ضروری ہے۔

آٹو کیڈ کا برابری/مساویت، یا مطابقت کا یہ نظریہ انفرادی الفاظ کی سطح تک محدود تھا جو Ato

Scanned with CamScanner

mistic linguistics کی پیداوار تھا، لیکن جوں جوں جدید لسانیات ارتقا پاتی گئی تو توجہ لفظی مناسبت یا مطابقت (Textucal Equivalence) سے ہٹ کر ساختی مناسبت (Structural Equivalence) کی طرف منتقل ہوگئی۔ ساختی مناسبت کی اصطلاح فلپک (Filipec) کی وضع کردہ تھی جولپ زگ (Liep Zig) اسکول کا نظریہ ساز تھا۔ اُس نے اس بات پر زور دیا کہ انفرادی لفظی متبادل کی بجائے پورے متن کے متبادل کو تلاش کرنا چاہیے۔ یعنی انفرادی الفاظ کے متبادل تلاش کرنے کی بجائے پورے متن کے مجموعی معنوں کو متبادل متن فراہم کرنا چاہیے۔

۳- باطنی ساخت کا نظریہ

یہ نظریہ بھی جرمنی کی پیداوار تھا اور اس کا اہم مرکز سار بروکن کی سارلینڈ یونیورسٹی (Saarland University, Saarbroken) تھی۔ اس مرکز سے جب Wolfron Wilss کی کتاب The Science of Translation: Problems and methods شائع ہوئی تو اس نے ترجمے کے جرمن نظریے کی اہم دستاویز کا درجہ حاصل کرلیا۔ ولس کا نظریہ چومسکی اور نَدا کے نظریات کا ملغوبہ ہے اور یہ بھی آفاقی زبان کے نظریے پر مبنی ہے جس کے مطابق اندرونی یا گہری ساخت ہی دراصل سب سے اہم ہوتی ہے۔ چناں چہ ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کی جانے والی ساری معلومات بنیادی یعنی سورس لنگویج کے متن کی باطنی ساخت میں موجود ہوتی ہیں۔ ترجمہ نگار کو اُن کا وفادار ہونا چاہیے۔ یعنی انھیں معلومات کو ترجمے کی زبان میں منتقل کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ سائنسی نہیں بلکہ یقینی تھا کیوں کہ یہ ترجمے کو بنیادی متن کی تخلیق نو کا درجہ دیتا تھا۔

۴۔ خوش اسلوبی سے کام نبٹانے والا اسکول

(The Manipulation School)

تھیو ہرمنس (The Hermans) اپنی کتاب The Manipulation of Literatur: Studies in Literary Translation میں لکھتا ہے کہ جہاں تک ٹارگٹ لٹریچر کا تعلق ہے سارے ترجمے کسی نہ کسی حد تک بنیادی متن کو خصوصی مقاصد کے تحت خوش اسلوبی سے نبٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بات کو مزید واضح کرتے ہوئے اس اسکول کا ایک اور دانش ور آندرے لیفیور (Andre Lefeuere) کہتا ہے کہ ترجمہ بنیادی طور پر متن کو ازسرِ نو تحریر کرنے

Scanned with CamScanner

کے مترادف ہے اور اس کا مقصد چاہے کچھ بھی ہو، از سرِ نو تحریر کرنے کا یہ عمل یقینی طور پر کسی فکر، نظریے اور شعریات کو ظاہر کرتا ہے۔ متعلقہ دور کی کیفیت، مزاج اور فطرت (Mood and Temprament) اسی طرح ترجمے کو خوش اسلوبی سے نبھانے کی کوشش کرتی ہے جس طرح وہ تاریخ نویسی، تنقید اور صحافت وغیرہ کو نبھاتی ہے۔ یہاں نبھانے کے معنی اپنے مقاصد کے لیے انھیں برتنے کے ہیں۔

آندرے لیفیور ترجمہ شدہ متن کو سورس لنگویج کے متن کا عکس نہیں بلکہ اس کا ایک نیا موڑ تصور کرتا ہے۔ یعنی ترجمہ سورس لنگویج کے متن کو نئی معنویاتی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ عکس کے معنی آئینے کی طرح کسی چیز کا ہو بہو عکس پیش کرنا ہے جب کہ منعطف (Refraction) کے معنی کسی چیز کو نئے زاویے سے دیکھنے کے ہیں۔ Perception میں تبدیلی کے ہیں۔

۵۔ نظریہ تمدن و ترجمہ

اتمار ایون ظہر (Itmar Even-Zoher) تمدن سے متعلق نظریہ ساز ہے نہ کہ ترجمے سے متعلق۔ اس نے اپنے کثیر الجہت (Polysystem) نظریے کی بنیاد روسی ہیئت پرستی خصوصاً تنجنف (Tynjanov) کے ادبی تنقید کے نظام مراتب (Hierarchical Literary System) کے تصور پر رکھی۔ روسی ہیئت پرست اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تمدن سارے نظاموں میں پیچیدہ ترین نظام ہے جس میں ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی وغیرہ بھی نظام شامل ہیں۔ مجموعی اعتبار سے یہ اسکول اس بات پر زور دیتا ہے کہ کسی متن کو معنی اُس کا تمدن اور وہ اقدار عطا کرتے ہیں جو اُس وقت رائج ہوں جب وہ ترجمہ کیا گیا۔ ترجمے کو مختلف شخصیات یا شناختوں کا حامل تصور کرنا چاہیے کیوں کہ اُس کی کوئی ایک مخصوص شناخت نہیں ہوتی۔ ان شناختوں کا دارومدار اُن قوتوں پر ہوتا ہے جو اُس وقت فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہیں جب ترجمہ کیا گیا۔

ہیئت پرستوں کے اس نظریے میں تین نکات ایسے ہیں جنھیں سمجھے بغیر ترجمے سے متعلق کوئی لائحۂ عمل تیار نہیں کیا جا سکتا:

(۱) متن کو معنی وہ تمدن یا نظام اقدار عطا کرتے ہیں جو اُس وقت رائج ہوں جب ترجمہ کیا گیا۔

Scanned with CamScanner

(۲) ترجمے کو مختلف شناختوں یا شخصیتوں کا حامل تصور کرنا چاہیے۔ اور

(۳) ترجمے کی شناختوں کو وہ قوتیں وزن و وقار عطا کرتی ہیں جو اُس وقت فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہوں جب ترجمہ کیا گیا۔

ان تینوں نکات پر غور کرنے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(ا) متن کے اپنے کوئی معنی نہیں ہوتے نہ ادیب یا فن کار اُسے کوئی معنی عطا کرتا ہے۔ وہ اگر اُس کے ذریعے کوئی معنی قاری تک پہنچانے کی کوشش بھی کرتا ہے تو بے کار ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اُس کے حتمی معنی تو وہ تمدن یا نظامِ اقدار متعین کرتے ہیں جو اُس وقت رائج ہوں جب ترجمہ کیا گیا۔ مثلاً کالی داس کے کسی ڈرامے کا اگر ہم آج ترجمہ کر رہے ہیں تو ہم اُس کے معنی وہ متعین نہیں کریں گے جو اُس وقت اُس کے تھے جب وہ ڈراما تخلیق ہوا۔ ہم اس کے وہ معنی متعین کریں گے جو آج ہمارا تمدن اور نظامِ اقدار اُسے عطا کرتا ہے۔ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم ترجمہ کالی داس کے ہم عصر قارئین کے لیے نہیں آج کے قارئین کے لیے کر رہے ہیں جو اُس مفہوم کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں جو اُن کے تمدن یا نظامِ اقدار کے حوالے سے اُن تک پہنچتا ہے۔

(۲) ترجمے کے مختلف شناختوں یا شخصیتوں کے حامل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ ہر متن کئی تفہیماتی سطحیں رکھتا ہے۔ کسی بھی متن کا نہ تو ایک مفہوم ہوتا ہے اور نہ ایک ترجمہ، جسے کلی قرار دیا جائے۔ اس لیے اُس کی مختلف قرأتوں کے دوران جو تفہیماتی جہتیں سامنے آتی ہیں اُن کا بھی ترجمہ کرنا ضروری ہے۔ بنیادی متن (سورس لنگویج کے متن) کی تفہیم و تحسین کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

(۳) تیسرا نکتہ کم و بیش پہلے نکتے کی ہی توسیع ہے، اس لیے اُس کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

۶۔ ردِ تشکیل اور ترجمہ

دریدا نے ردِ تشکیل کا جو نظریہ پیش کیا وہ سوسیر کے لسانی نظریے کی ہی پیداوار ہے۔ سوسیر نے زبان کو نظامِ نشانات (Sign System) قرار دیا۔ اُس کے خیال میں ہر نشان کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی شے کو نشان زد کرتا ہے یعنی Signifier ہے اور دوسرا وہ جس کو نشان

Scanned with CamScanner

زد کیا جاتا ہے یعنی جو Signified ہے۔ Signifier آواز یا تصویر کی شکل میں ہوتا ہے جب کہ Signified معنی کے تصور سے وابستہ یا معنی کی صورت میں مثلاً انگریزی زبان کے یہ تین حروف C,A,T Signifier ہیں جو ہمارے ذہن میں بلی کی تصویر بناتے ہیں یہاں بلی Signified ہے۔ Signifier اور Signified کے درمیان رشتہ من مانا (Arbitrary) ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ CAT کے معنی بلی کے لیے جائیں سوائے اس کے کہ تمدنی اور تاریخی روایت نے ایسا سوچنے کے لیے مجبور کیا ہے۔

ہرنشان کو کوئی مخصوص معنی صرف اس لیے حاصل ہیں کہ وہ دوسرے نشانات سے مختلف ہے۔ CAT کے کوئی معنی نہیں ہیں سوائے اس کے کہ وہ Cap یا Cad یا Bat نہیں ہے۔ یہی اختلاف اُسے معنی عطا کرتا ہے۔

سوسیئر کے اس نظریے میں وسعت پیدا کرتے ہوئے دریدا کہتا ہے کہ کسی ایک زبان کے Signified کو پورے طور پر دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ معنوں کی بنیاد غیر مستحکم ہے اس لیے ترجمے کی بات کرنے کی بجائے ہمیں تبدیلی یا قلب ماہیت (Transformation) کی بات کرنی چاہیے۔ ترجمے کی زبان ہمیشہ بنیادی متن کو ترمیم (Modify) کرتی ہے۔ دریدا اپنے اس نظریے کی وضاحت والٹر بنجامن کے Uberleben (After Life) کے تصور کی مدد سے کرتا ہے۔ ...... بنجامن کہتا ہے ترجمہ نہ تو Source oriented ہوتا ہے نہ ٹارگٹ اوریئنڈ (Target Oriented) بلکہ وہ اپنی ہی طرح کا واحد اور منفرد اسلوب ہوتا ہے اور ترجمہ چوں کہ بنیادی متن کو نئی زندگی یا دوسری زندگی دیتا ہے اس لیے یہ متن کی مابعد زندگی ہوتی ہے جسے وہ After Life سے منسوب کرتا ہے۔ بنجامن مزید کہتا ہے کہ ترجمے میں بنیادی متن وسیع ہوجاتا ہے۔ دریدا اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ترجمہ ایک بچے کی طرح عمل کرتا ہے جو قانونِ پیدائش کے مطابق محض ایک پیداشدہ چیز نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ اُس میں خود بخود، نئے، مختلف اور اپنے منفرد انداز میں بات چیت کرنے یا بولنے کی قوت بھی ہوتی ہے۔ اس طرح وہ زبان کی معاونت کر کے اُسے ترقی دینے کا موجب ہوتا ہے۔

دریدا کے اس تصور نے کہ متن کے اپنے کوئی مخصوص معنی نہیں ہوتے اُسے معنی تو قاری عطا کرتا ہے، ترجمے کے لیے نئے مسائل پیدا کیے۔ دریدا کا یہ تصور اگرچہ نیا نہیں تھا کیوں کہ اس سے قبل بھرتری ہری اور اتمار ایون ظہر کچھ اسی قسم کی بات کر چکے تھے لیکن دریدا کے دلائل نے اس

Scanned with CamScanner

نظریے کو عالمی شہرت عطا کرنے کا کام انجام دیا۔[۳]

دریدا نے متن کے مفہوم کی جس تکثیریت کو پیش کیا اُس نے ترجمے کو بھی کثیر الجہت بنانے کی کوشش کی تاہم یہاں یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ضروری نہیں مختلف قاری ہی کسی متن کو پڑھ کر اس کے مختلف معنی متعین کریں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی قاری کسی ایک متن کو مختلف اوقات میں پڑھ کر اس کے مختلف یا پہلے سے قدرے وسیع معنی متعین کرے اور اس طرح ہر بار جب وہ اس کا ترجمہ کرے تو پہلے سے قدرے مختلف ترجمہ وجود میں آجائے یا پہلے ترجمے کی تردید کرتے ہوئے بالکل ہی کوئی نیا ترجمہ دیکھنے کو ملے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غالب، اقبال اور شیکسپیئر کو جتنی بار بھی پڑھنے کی کوشش کی جاتی ہے افہام وتفہیم کے نئے زاویے سامنے آجاتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان ادیبوں کو سمجھنے کے لیے سیکڑوں کتابیں وجود میں آنے کے بعد بھی یوں لگتا ہے جیسے ابھی انصاف ہونا باقی ہے۔

ترجمے کے اقسام

دنیائے ادب میں اب تک ترجمے کا جتنا بھی کام ہوا ہے ہم اُسے مجموعی اعتبار سے دو بڑے زمروں میں رکھ سکتے ہیں:

۱- موضوعاتی
۲- ہیئتی یا فنی

موضوعاتی زمرے میں ترجمے کے جو اقسام شمار کیے جاسکتے ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱- علمی ترجمہ، ۲- ادبی ترجمہ، ۳- صحافتی ترجمہ

اسی طرح ہیئتی زمرے میں حسبِ ذیل اقسام کو رکھ سکتے ہیں:

۱- لفظی ترجمہ، ۲- آزاد ترجمہ، ۳- تخلیقی ترجمہ (منظوم یا منثور)

ترجموں کی یہ گروہ بندی حتمی ہرگز نہیں ہے۔ کوئی اور تحریر سامنے آنے پر صورتِ حال میں تبدیلی ہوسکتی ہے یا زمروں کی ترتیب بدل سکتی ہے کیوں کہ علم و آرٹ کی دنیا میں کوئی فیصلہ آخری نہیں ہوتا۔ زندگی کی طرح نئے امکانات کی گنجائش وہاں بھی ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ اس لیے مندرجہ بالا تقسیم کو محض ایک پڑاؤ تصور کرنا چاہیے منزل نہیں۔

Scanned with CamScanner

ان ابتدائی معروضات کے بعد آیئے اب ان سبھی اقسام سے متعلق کچھ نہ کچھ بات اور ہو جائے تا کہ انھیں سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱- علمی ترجمہ

ترجمے کی اس قسم میں جن علوم کے تراجم کو شمار کیا جاتا ہے اُن میں تمام سائنسی علوم وفنون شامل ہیں۔ اس طرح کے تراجم کا بنیادی مقصد معلومات کی ترسیل ہوتا ہے اس لیے ترجمے کی زبان جتنی صاف وشفاف اور ابہام سے عاری اور قاری کی ذہنی سطح سے قریب ہوگی ترجمہ اپنے مقصد میں اتنا ہی کامیاب گردانا جائے گا۔ اس طرح کے تراجم کی کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے جب اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ ایک تو ترجمہ نگار خود اُس علم کا ماہر ہو جس کا ترجمہ کرنا مقصود ہے اور دوسرے ترجمہ کرتے وقت اُن قارئین کو ذہن میں رکھا جائے جن کے لیے ترجمہ کیا جارہا ہے۔
ترجمہ نگار کو متعلقہ علم کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ اُس زبان پر بھی ماہرانہ قدرت رکھنا چاہیے جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے۔ نیز اُس زبان کے لسانی، علمی، ادبی اور تمدنی انسلاکات سے بھی پوری طرح واقف ہو جس میں لکھی کسی تحریر کو وہ ترجمے کی صورت دے رہا ہے۔ یعنی S.L اور T.L دونوں سے اگر قابلِ قدر واقفیت نہیں تو معلومات کی ترسیل صحیح ہونے کے امکانات مخدوش ہو جاتے ہیں۔

علمی ترجمہ کرتے وقت سب سے زیادہ دقت علمی اصطلاحات کے مترادفات تلاش کرنے میں پیش آتی ہے۔ مرزا حامد بیگ اس سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''علمی تراجم میں اہم مسئلہ علمی اصطلاحات کے مترادفات ڈھونڈنے کا ہوتا ہے۔ علمی اصطلاحات وضع کرتے وقت اس امر کا بالخصوص خیال رکھا جانا چاہیے کہ اصطلاحیں مسلّم اصولوں کے عین مطابق ہوں، نیز لاطینی، یونانی اور دوسرے سابقوں اور لاحقوں کے ترجمے/ مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے ...... جہاں تک علمی اور فنی تراجم کا تعلق ہے، ضروری ہے کہ متعلقہ مضمون (علم وفن) کا ماہر ہی یہ کام انجام دے۔ اس کا سب سے بڑا سبب اور ضرورت یہ ہے کہ ہر علم وفن میں اصطلاح کا مضمون سے متعلق اپنا مفہوم ہوتا ہے جو دوسرے علوم وفنون میں نہیں ہوتا۔ مثلاً ثقافت کا لفظ عمرانیات میں کچھ اور معنی دیتا ہے اور

Scanned with CamScanner

فنون میں اُس کا کچھ اور مفہوم متعین ہے جب کہ لغت میں اس کے متعدد معنی درج ہیں۔ علمی سطح پر اس کی ایک بہتر مثال مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ 'معرکہ مذہب و سائنس' ہے''۔

(اوراق، لاہور)

مندرجہ بالا اقتباس میں 'مترادفات میں یکسانیت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے' کے معنی اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ ایک بار کسی اصطلاح کے لیے جو بھی متبادل اصطلاح استعمال ہو، بعد میں اُسے بدلنے کی کوشش نہ کی جائے اس سے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مثلاً عربی کی اصطلاح امیر البحر کے لیے اگر ہم Admiral کی متبادل اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو بعد میں جہاں جہاں امیر البحر کی اصطلاح آئے وہاں وہی متبادل اصطلاح یعنی Admiral استعمال کی جانی چاہیے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی خاص اصطلاح کے لیے جب کوئی متبادل اصطلاح یکسانیت کے ساتھ بار بار استعمال ہوتی ہے تو اُسے قارئین سے شرف قبولیت حاصل ہو جاتا ہے جو اس کے چلن کی ضمانت دیتا ہے۔

نمونے کے طور پر چند علمی متون کے اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ طالب علم کے ذہن میں کوئی شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہے:

متن:

1. After we came out of the church, we stood talking for some time together of Bishop Berkeley's ingenious sophistry to prove the non-existance of matter, and that everything in the universe is merely ideal. I observed, that though we are satisfied his doctrine is not true, it is impossible to refute it. I shall never forget the alacrity with which Johnson answered, striking his foot with mighty force against a large stone, till he rebounded from it. 'I refute it thus!'
(James Boswell: Life of Johnson, circa 1710)

Scanned with CamScanner

علمی ترجمہ:

گرجا گھر سے باہر آنے کے بعد ہم کچھ دیر تک شپ برکلے سے اُس اختراعی سوفسطائیت کے بارے میں بات کرتے رہے جس کا استعمال انھوں نے یہ ثابت کرنے کے لیے کیا کہ مادہ وجود نہیں رکھتا اور یہ کہ اس کائنات میں ہر شے محض مثالی ہے۔ میں نے کہا اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ اُس کے دلائل حقائق پر مبنی نہیں ہیں پھر بھی اُن کی تردید کرنا ممکن نہیں۔ میں اُس پھرتی کو ہرگز نہ بھول پاؤں گا جس سے جانسن نے ایک بڑے پتھر کو اپنے پاؤں سے پُرزور ٹھوکر مارتے ہوئے جواب دیا کہ "میں یوں اُس کی تردید کرتا ہوں"۔

متن:

The Elephant (which some call an oliphant)is the biggest of all fourfooted beasts, his forelegs are longer than his hinder, he hath ankles in the lower part of his hinder legs, and five toes on his feet undivided, his snout or trunk is so long, and in such form, that it is to him in the stead of a hand: for he neither eateth nor drinketh but by bringing his trunk to his mouth, therewith he helpeth up his master or keeper, there with he overthroweth trees. Of all beasts they are most gentle and tractable, and are of quick sense and sharpness of wit. They love rivers, and will often go into them up to the snout, wherewith they blow and snuff and play in the water. They have continual war against dragons, which desire their blood because it is very cold: and therefore the dragon lieth in wait as the elephant passeth by.

(Richard Hakluyt: Voyages and Discoveries, 1554)

علمی ترجمہ:

Scanned with CamScanner

ہاتھی چار پاؤں والے جانوروں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کی اگلی ٹانگیں پچھلی سے لمبی ہوتی ہیں۔ اس کے ٹخنے پچھلی ٹانگوں کے نچلے حصے میں ہوتے ہیں۔ پاؤں میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔ اس کی سونڈ اتنی لمبی اور ایسی ہوتی ہے جو اس کے لیے ہاتھ کا کام کرتی ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی سونڈ کو منہ تک پہنچائے بغیر نہ تو کچھ کھا سکتا ہے نہ پی۔ اُس کی مدد سے وہ اپنے مہاوت کو اپنی پیٹھ پر بٹھاتا ہے۔ اس سے وہ پیڑوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے۔ سارے جنگلی جانوروں میں وہ سب سے شریف اور قابو میں کیا جانے والا جانور ہے۔ نیز بات کو فوراً سمجھ جانے والا اور عقل مند جانور ہے۔ وہ دریاؤں سے عشق کرتا ہے اور سونڈ تک اس میں گھس جاتا ہے اور سونڈ کی مدد سے پانی اچھالتا اور اس سے کھیلتا ہے۔

ڈریگن نام کی مکھی سے اُن کی مسلسل جنگ ہوتی ہے جو اُن کے خون کو پسند کرتی ہیں کیوں کہ وہ سرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ہاتھیوں کے قریب سے گزرنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔

ادبی ترجمہ:

ترجمے کی اس قسم کا بنیادی مقصد ترجمے کے لسانی پہلو کو اس حد تک شستہ بنانا ہے کہ وہ کسی طبع زاد تخلیق سے قریب ہو جائے۔ یہ کام ترجمہ نگار اُس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک وہ ترجمے کی زبان کو بامحاورہ نہیں بناتا۔ استعارات، تشبیہات اور ضرب الامثال و علامات کی مدد سے اُس میں وہ تاثیر پیدا نہیں کرتا جو قاری کو مسرت سے بصیرت تک پہنچاتی ہے۔ بقول مرزا حامد بیگ ”یوں ادبی ترجمے میں مترجم اپنے خیال، اپنے وجود، اپنے جذبے، اپنی انا پیشگی اور اپنے قلم کو اصل مصنف کے تابع کر دیتا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ اگر فلاں بات اور فلاں عبارت مصنف کو ہماری زبان میں لکھنا ہوتی تو وہ کس طرح لکھتا، جس طرح اصل مصنف اس دوسری زبان میں اُسے لکھتا، بعینہٖ ویسا لکھنے کا جتن کرنا چاہیے“۔

ادبی ترجمہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ بنیادی متن کا مرکزی خیال کسی بھی طرح سے مجروح نہ ہونے پائے اور بظاہر سورس لنگویج کے متن کا مصنف جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اس حد تک دھندلا نہ ہو جائے کہ کہیں دکھائی ہی نہ دے۔ یہی توقع اُن قارئین سے بھی کی جاتی ہے جو بنیادی متن کے ایک سے زیادہ معنی متعین کرتے ہیں۔ مزید وضاحت کے لیے نیچے دو اقتباسات کے تراجم پیش کیے جا رہے ہیں۔

پہلا نمونہ

Scanned with CamScanner

بنیادی متن:

In the process of what we usually call 'day-dreaming' we can imagine ourselves with unusual strength or unexpected abilities. We can marry a prince or inherit a fortune. We are limited only by our own imaginations. Our plan of action does not have to be the one which is likely to succeed in practise because we are able to imagine the achivement of our goal as well as the means to its achivement. There are such wonderful possibilities in this solution of our problems that some people, unable to cope with the practical requirements of life, fall back completely on it.Unfortunately it fails to give physoilogical satisfaction with its psychological satisfaction, so that such people may require institutional care.

سادہ ترجمہ:

جاگتے میں خواب دیکھنے کے عمل کے دوران ہم خود کو بہت ہی طاقتور یا غیر معمولی قابلیت یا صلاحیتیں رکھنے والا تصور کر سکتے ہیں، تصور میں ہی کسی شاہزادی سے شادی رچا سکتے ہیں یا بے پناہ دولت کے وارث بن سکتے ہیں۔ ہماری اس سوچ کا عمل اتنا ہی وسیع یا محدود ہو سکتا ہے جتنا خود ہمارا تصور ہے۔ ہمارے عمل کے منصوبے کا ویسا ہونا ضروری نہیں ہے جس پر عمل کیا جا سکے کیوں کہ ہم اپنی منزلوں کے حصول اور اُن تک پہنچنے کے وسائل کے بارے میں سوچ سکتے ہیں۔ ہمارے مسائل کے حل کے لیے اس میں اتنے حیران کن امکانات ہیں کہ کچھ لوگ عمل زندگی کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے خود پورے طور پر اس کا سہارا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ عمل نفسیاتی تسکین کے ساتھ ساتھ جسمانی تسکین فراہم نہیں کر سکتا چناں چہ ایسے لوگوں کو ہو سکتا ہے کسی ذہنی امراض کے اسپتال یا ادارے کی دیکھ بھال کی ضرورت پڑے۔

ادبی ترجمہ:

Scanned with CamScanner

جاگتے خواب دیکھتے ہوئے ہم اپنے بارے میں یہ سوچ سکتے ہیں کہ ہم غیر معمولی طور پر طاقت ور یا غیر متوقع صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کسی شہزادی سے ازدواجی بندھن میں منسلک ہو سکتے ہیں یا بے پناہ دولت کے وارث بن سکتے ہیں۔ ہماری سوچ کے عمل کی کوئی حد نہیں ہے سوائے اس کے کہ جتنا ہم سوچ سکیں۔ ہمارے تصوراتی منصوبوں کا عملی ہونا بھی ضروری نہیں ہے کیوں کہ تصور کی دنیا میں ہم منزلوں کے حصول اور اُن تک پہنچنے کے وسائل کے بارے میں بھی سوچ سکتے ہیں۔ تصور کے پیش کردہ حل میں ہماری مشکلات کو سلجھانے کے اتنے امکانات ہوتے ہیں کہ کچھ لوگ کلیتاً اِسی کو اپنا آخری سہارا بنا لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ نفسیاتی تسکین طبعی تسکین کا موجب نہیں بن پاتی جس سے ایسے لوگوں کو نفسیاتی بیماریوں کے علاج کرنے والے اداروں کی دیکھ بھال کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

دوسرا نمونہ

بنیادی متن:

A simple example of what I shall call a visual metaphor is the use of the colour red in certain cultural contexts. Red, being the colour of flames and of blood, offers itself as a metaphor for anything that is strident or violent. It is no accident, therefore, that it was selected as the code sign for 'stop' in our traffic code and as a label of revolutionary parties in politics.

But though both these applications are grounded on simple biological facts, the colour red itself has no fixed 'meaning'. A future historian or anthropologist, for instance, who wanted to interpret the significance of the label 'red' in politics would get no guidance from his knowledge of our traffic code. Should the colour that denotes 'stop' not stand for the 'conservatives' and green for the 'go-ahead' progressives? And how should he interpret the

Scanned with CamScanner

meaning of the red hat of the cardinal or the Red Cross?
(E.H. Gombrich, 'Visual Metaphors of Value in Art', in Meditations on a Hobby Horse)

سادہ ترجمہ:

کچھ تمدنی وثقافتی استعمال کے سیاق وسباق میں لال رنگ کا استعمال ایک مرئی یا واضح استعارے کی سیدھی سادی مثال ہے۔ شعلوں یا خون کا رنگ ہونے کی وجہ سے 'لال رنگ' خود کو ہر اس چیز کے استعارے کے طور پر پیش کرتا ہے جو سخت کرخت یا تشدد آمیز ہو۔ چناں چہ یہ کوئی حادثہ نہیں ہے کہ ہمارے ٹریفک کے اشاروں میں اسے رُکنے اور سیاست میں انقلابی تنظیموں کے نشان کے طور پر منتخب کیا گیا۔

اس کے استعمال کی یہ دونوں صورتیں اگر چہ سیدھے سادے حیاتیاتی حقائق پر مبنی ہیں تاہم 'لال رنگ' کا اپنا کوئی مخصوص مفہوم نہیں ہے۔ مثلاً مستقبل کا تاریخ نویس یا ماہر بشریات جو لال رنگ کے نشان کی سیاست میں اہمیت کی تشریح کرنا چاہے گا اُس کو ٹریفک کے اشاروں سے متعلق اپنے علم سے کوئی رہبری حاصل نہ ہوگی۔ کیا وہ رنگ جو رُکنے کے معنی دیتا ہے اُسے رجعت پرستوں کا مفہوم ادا نہیں کرنا چاہیے اور سبز رنگ کو ترقی پسند انقلابیوں کی ترجمانی نہیں کرنی چاہیے اور پھر اُسے کارڈینل کی سرخ ٹوپی اور ریڈ کراس کے سرخ نشان کی کس طرح سے وضاحت کرنی چاہیے؟

ادبی ترجمہ:

ثقافتی استعمال کے کچھ حوالوں میں 'لال رنگ' مرئی استعارے کی سیدھی سادی مثال ہے۔ شعلوں اور خون کا رنگ ہونے کی وجہ سے 'لال رنگ' ہر اُس چیز کا استعارہ بننے کی پیش کش کرتا ہے جو کرخت اور تشدد آگیں ہے۔ چناں چہ یہ محض ایک حادثہ نہیں ہے کہ ہمارے ٹریفک کے اشاروں میں اسے 'رُکنے' اور سیاست میں انقلابی تنظیموں کے لیبل کے طور پر منتخب کیا گیا ہے۔

لیکن استعمال کی یہ دونوں صورتیں اگر چہ سیدھے سادے حیاتیاتی حقائق پر مبنی ہیں، لال رنگ کے کوئی مخصوص معنی نہیں ہیں۔ مثلاً مستقبل کا مورخ یا ماہر بشریات جو سیاست میں لال رنگ کی اہمیت کی تشریح کرنا چاہے گا اُسے ٹریفک کے نشانات سے متعلق اپنے علم سے کوئی رہبری حاصل

Scanned with CamScanner

نہ ہوگی۔ کیا وہ رنگ جوڑ کنے کے معنوں کی علامت ہے اُسے رجعت پرستوں کی اور سبز رنگ کو ترقی پسند انقلابیوں کی علامت نہیں بننا چاہیے۔ اور پھر کارڈینل کی سرخ ٹوپی اور ریڈ کراس کے سرخ نشان کی اُسے کس طرح تشریح کرنا چاہیے؟

بنیادی متن:

Everything is virtuous in its nature that fulfills the purpose for which it is obtained, and the better it does this, the more virtuous it is, therefore we call him a good man who leads the contemplative or the active life for which his nature fits him; we call the horse good that runs fast and far which he is created to do; we call the sword good that cuts hard things with ease for which end it is made. Thus language being ordained to express human conceptions, is good when it does this; and the more perfectly it does it the better it is.

(Dante)

ادبی ترجمہ:

ہر شے فطری اعتبار سے اپنی ایک فضیلت رکھتی ہے اگر وہ ان مقاصد کو پورا کرتی ہے جس کے لیے اس کو تخلیق کیا گیا ہے۔ جتنا کمال خوبی کے ساتھ یہ ان مقاصد کو پورا کرتی ہے اتنا اسے مکمل تصور کیا جائے گا۔ مثلاً ہم ایک شخص کو اس لیے اچھا گردانتے ہیں کہ وہ نیک نیتی سے زندگی گزارتا ہے جو اس کی شخصیت کے عین مطابق ہوتی ہے۔ ہم گھوڑے کو اچھا اس لیے سمجھتے ہیں کہ اس میں دور تک تیز بھاگنے کا تعمیری وصف ہے، ہم تلوار کی اچھی تعریف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ مشکل ہدف کو بہ آسانی چیر دیتی ہے جو اس کا جوہر ہے۔ اسی طرح زبان جو ترسیل وابلاغ کے لیے معین کی گئی ہے، بہتر ہے اگر وہ اظہار کو استحکام بخشتی ہے۔ جتنی کامیابی سے یہ فکر کی تجسیم کرے گی اتنا ہی اسے کامیاب تصور کیا جائے گا۔

Scanned with CamScanner

بنیادی متن:

"The Last Rose of Summer"

So soon may I follow
When freindship decay
And from love's shining circle
The gems drop away

(Thomas Moore)

منظوم ادبی ترجمہ:

<u>''موسمِ بہار کا آخری پھول''</u>

(۱) جن سے آباد تھی بزمِ الفت — ایسے احباب کا جلسہ نہ رہا
اب نہیں نامِ محبت باقی — مل گئے خاک میں اربابِ وفا
(مترجم حسرت موہانی)

<u>''موسمِ بہار کا آخری پھول''</u>

(۲) کیا لے کے آہ کوئی کرے عمرِ جاوداں — سلکِ وفا میں جب نہ رہے دُرِ آبدار
یارانِ رفتہ کا ہے زیارت کدہ جہاں — میری بھی بے کسی کا بنے گا وہیں مزار
(مترجم سرور جہاں آبادی)

بنیادی متن:

Loves Philosophy

Nothing in the world is single
All things by a law divine
In one another's being mingle
Why not I with thine?

(Shelly)

منظوم ادبی ترجمہ:

Scanned with CamScanner

فلسفۂ محبت

کائنات کی کوئی شے تنہا نہیں ہے
دنیا کی جملہ اشیا فطرت کے اصول پر ہمکناری کی خواہش مند ہیں
پھر میں کیوں نہ اپنی ذات کو تیری ہستی میں فنا کر دوں

(مترجم ناظر کاکوروی)

فلسفۂ محبت

(۲) جگ بھر میں کوئی نہیں ہے خالی — ہر چیز کو ہے لگن کسی کی
قدرت کا ہو میری جان یہ قانون — ہو مجھ سے نفور تو ہے موزوں؟

(مترجم..................)

مشق: درج ذیل اقتباسات کا ادبی ترجمہ کیجیے:

Translate the passage below, paying particular attention to the vocabulary and tone of the text.

The Elephant

The Elephant (which some call an oliphant)is the biggest of all fourfooted beasts, his forelegs are longer than his hinder, he hath ankles in the lower part if his hinder legs, and five toes on his feet undivided, his snout or trunk is so long, and in such form, that it is to him in the stead of a hand: for he neither eateth nor drinketh but by bringing his trunk to his mouth; therewith he helpeth up his master or keeper, therewith he overthroweth trees. Of all beasts they are most gentle and tractable, and are of quick sense and sharpness of wit. They love rivers, and will often go into them up to the snout, wherewith they blow and snuff and

Scanned with CamScanner

play in the water. They have continual war against dragons, which desire their blood because it is very cold: and therefore the dragon lieth in wait as the elephant passeth by.

(Richard Hakluyt: Voyages and Discoveries 1554).

When I first saw him, I thought, if I had not been let into his Character and Story, I could have discerned that he had been much separated from Company, from his Aspect and Gesture; there was a strong but cheerful seriousness in his Look, and a certain Disregard to the ordinary things about him, as if he had been sunk in Thought. When the ship which brought him off the Island came in, he received them with the greatest Indifference, with relation to the Prospect of going off with them, but with great satisfaction in an opportunity to refresh and help them. The man frequently bewailed his Return to the World, which could not, he said, with all its Enjoyment, restore him to the Tranquility of his Solitude.

(quoted in Gavin Young: Slow Boats Home)

The following passages contain proverbs sayings. Try to find suitable equivalents in your own language for the epressions italics in the passages below. In many cases, a literal translation will not be possible. Feel free, then, to experiment, but try to suit your translation to the context of the passage.

1. Common opinion tends to stress the importance of practice. We say:'Practice makes perfect', but this is certainly not true. In an experiment with dart throwing, sujects were given long continued practice, but each time they threw a dart the light was switched off before they could see the result. Under these circumstances their scores deteriorated rather than improved.The value of practice is that it enables us to discover what works. But unless we know the results of our effort there can be no reward and so no reinforcement.

(C.J.Adcock:Fundamentals of Psychology)

2. THE ROT. AND HOW TO STOP IT

Wet rot, dry rot, and woodworm. Three little things hellbent on destroying the wood in your home. With 5-Star Cuprinol there's no need to worry about what sort of rot you've got because it gets rid of the lot. Cuprinol 5-Star. There's no better way to stop the rot.

(advertisement for Cuprinol wood-preserver)

3. A third cause of disagreement between IQ measures and external criteria may be related to motivation. If we can lead a horse to the water, so we can send a child to school, but as we cannot make the horse drink, so we cannot make the child learn unless he is in fact motivated.

(H.T. Eysenck: Check Your Own IQ)

4. THERE COMES A TIME WHEN SILENCE ISN'T GOLDEN

Scanned with CamScanner

Whether it's a telephone that doesn't ring, or a cherished instrument that sits silently in a corner, the twilight years of a musician can prove deathly quit. After a life where the sound of applause was an everyday event, the silence can prove deafening. But you can help. (appeal for the Musicians Benevolent Fund)

نوٹ: انگریزی کے سارے اقتباسات ایلن ڈف (Alan Duff) کی کتاب Translation سے لیے گئے ہیں۔

صحافتی ترجمہ:

ترجمے کی اس قسم کو سب سے آسان اس لیے تصور کیا جاتا ہے کہ اس میں لفظ بہ لفظ یا جملہ بہ جملہ ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کسی اقتباس کو پڑھ کر اُس کے مجموعی مفہوم کو ترجمہ نگار اپنی زبان میں پیش کر دیتا ہے۔ اس میں لفظوں کے متبادل تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ کسی زبان کے اقتباس کی طوالت یا پیچیدگی کی وجہ سے ترجمے کو بھی ویسا ہی بنانا پڑتا ہے۔ اس کا ... مفہوم ترجمہ نگار سیدھی سادی زبان اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش کر دیتا ہے تاکہ اُس سے اخبار کے قارئین کو اسے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ ترجمے کی اس قسم کو 'کھلا ترجمہ' کے عنوان سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالمجید سالک ترجمے کی اس قسم سے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اخباری ترجمے میں سب سے مقدم مصلحت یہ ہے کہ مطلب بالکل واضح اور عبارت قطعی طور پر سلیس ہو جائے تاکہ تمام پڑھنے والوں کو کوئی الجھن نہ ہو۔ اس کے لیے اپنی زبان کا محاورہ سب سے بہتر رہنما اور معاون ہے۔ اگر اخباری مترجم سادگی، سلاست اور محاورۂ اردو کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کریں تو خود بھی آرام سے رہیں اور پڑھنے والوں کے ذہن بھی نہ الجھیں۔ اُن کو چاہیے کہ جہاں انگریزی کے فقرے کی ترکیب پیچیدہ اور طویل پائیں وہاں اُس کی چیر پھاڑ کر دیں اور ترجمہ کرنے کے بعد ایک بار پڑھ کر دیکھ لیں کہ آیا اصل مطلب ادا ہو گیا ہے۔ اگر ہر پہلو

Scanned with CamScanner

سے مطلب ادا ہو گیا ہو تو سبحان اللہ، ورنہ اِدھر اُدھر کی بیشی کر کے اُسے پورا کر دیں۔ ڈکشنری مترجم کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اور اس سے ہر ممکن مدد لینی چاہیے اور کبھی اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہم بڑے انگریزی داں اور بڑے اردو خواں ہیں کیوں کہ ممکن ہے وقت پر کسی لفظ کا صحیح اور موزوں ترجمہ نہ سوجھے اور ڈکشنری دیکھنے سے ایسا نفیس لفظ ہاتھ آ جائے جو فقرے میں جان ڈال دے''۔

مرزا حامد بیگ صحافتی ترجمے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''چوں کہ اخباری ترجمہ زیادہ بناؤ سنگھار اور خوش بیانی کی بجائے نفسِ مضمون ادا کرنے سے متعلق ہے اس لیے اُس کا ادبیت سے دور ہونا بھی ایک طرح کی خوبی بن جاتا ہے۔ صحافتی تراجم روزمرہ زندگی سے قریب ہونے کے سبب زبان کو نت نئے الفاظ اور پیشہ ورانہ اصطلاحات بخشتے اور اُس میں وسعت پیدا کرتے ہیں۔ یوں بعض اوقات صحافتی ترجمہ بھی تخلیقی ادب پر اثر انداز ہوتا ہے''۔

(ص ۱۲۰)

نیچے کچھ اقتباسات کے صحافتی تراجم پیش کیے جا رہے ہیں۔

اقتباس:

One of the most important points about this new office block is that it makes use of an effective heat recovery system which maintains office temperatures at 21°C. The basic principle of the system is that it uses reclaimed heat which has been generated within the building from lights, office machinery, and occupants.In this way, a controlled even temperature within offices can be achieved for a relatively small increase in

Scanned with CamScanner

capital outlay, at the same time cutting down energy consumption to a minimum.

ترجمہ:

دفاتر کی اس عمارت کا ایک خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ایک موثر تپش بازیافت کا نظام استعمال کر کے درجۂ حرارت کو ۲۱ ڈگری سیلیس سے آگے نہیں بڑھنے دیتی۔ اس میں روشنیوں، دفتری مشینوں اور کام کرنے والے ملازمین کی وجہ سے جو تپش پیدا ہوتی ہے اس کے ازسرِ نو استعمال سے درجۂ حرارت کو ۲۱ ڈگری سیلیس تک محدود رکھا جاتا ہے۔ چناں چہ اس طرح اخراجات میں تھوڑا سا اضافہ کر کے نہ صرف درجۂ حرارت کو قابو میں رکھا جا سکتا ہے بلکہ بجلی کے صرفے کو بھی کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔

اقتباس:

2. PRACTICE REALLY DOES MAKE PERFECT

Without doubt, Chris Evert has secured her place in the Tennis Hall of Fame. On court, Chris Evert is a very tough competitor indeed. Off court, however, she reveals both wit and charm. These two contrasting facets of Chris Evert-machine-like efficiency, and feminine charm and style-are also perfectly embodied in her watch. 'I know that Rolex have been making watches for a long time, and "practice makes perfect" is something I agree with.'

(advertisement for Rolex watches)

ترجمہ:

بے شک کرس ایورٹ نے ٹینس کے ہال آف فیم میں اپنی جگہ محفوظ کر لی ہے۔ ٹینس کے میدان میں تو وہ سخت مقابلہ کرنے والی خاتون ثابت ہوئی ہے لیکن اس کے باہر وہ اپنی ذہانت اور جادوئی شخصیت ان دونوں کا بخوبی مظاہرہ کرتی ہے۔ اُس کی شخصیت کے ہر دو متضاد پہلو یعنی حسی

Scanned with CamScanner

قابلیت اور نسائی حسن و اسلوب اس کی گھڑی میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ مجھے علم ہے کہ رولیکس کمپنی ایک مدت سے گھڑیاں بنا رہی ہے اور مجھے اس سے کلی اتفاق ہے کہ مشق ہمیشہ مکمل بناتی ہے۔

(رولیکس گھڑیوں کی تشہیر کے لیے اشتہار)

مشق: نیچے دیے ہوئے اقتباسات کا صحافتی ترجمہ کیجیے:

1. The teacher can suggest the best distribution of time for adequate training. Should learning periods be long? Should we 'strike while the iron is hot', or should we do a little at a time and avoid fatigue? The optimum length for the learning periods will vary from task to task and the teacher should be able to advise. In general it is found that short periods with appreciable rest Periods between are most economical.
(C.J. Adcock: Fundamentals of Psychology)
2. The moral fibre which sustained mid-Victorian Britain in its era of greatnest was derived only partly from the values of liberalism. The evils of philistinism, smugness, and bad taste were there from the first: it was when they ceased to be restrained and offset by the practice of the Christian virtues that the moral rot set in.
(David Thomson: England in the Nineteenth Century)
3. The latest Fire Test Certification tests on Pilkington Glass demonstrate yet again its ability to hold back flames and smoke for at least 60 minutes. Don't play with fire. Specify Pilkington Polished Wired Glass, and you'll be on the safe side.

Scanned with CamScanner

(advertisement for Pilkington Glass)

4. A small group of Englishmen conceived the idea of seeking a north-eastern passage to Asia through Arctic waters. As early as 1527 a small book had appeared prophesying such a discovery. One phrase rings out:'There is no land uninhabitable, nor sea unnavigable.'
(quoted in Winston Churchill: A History of the English Speaking Peoples)

ترجمہ و تخلیق یا تخلیقِ نو

یاد رکھیے یہاں نہ تو تخلیقی ترجمے سے بحث مقصود ہے نہ ادبی یا منظوم ترجمے سے اور نہ یہاں اس بحث کو چھیڑنا مقصود ہے کہ تخلیق بذاتِ خود اُن خیالات و احساسات کا ترجمہ ہوتی ہے جو ادیب کے ذہن میں نمودار ہو کر تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہاں مقصد اُس ترجمے کی وضاحت کرنا ہے جو کسی ایک زبان کے فن پارے کو دوسری زبان میں تخلیقِ نو کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس طرح کے ترجمے کے لیے بنیادی متن میں کچھ خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ ہر طرح کے متن کا ترجمہ تخلیقِ نو کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ صرف کچھ خصوصیات کا حامل متن ہی اُس تحریک کا موجب ہوتا ہے جو ترجمے کو تخلیقِ نو کا روپ دے دے۔ وہ خصوصیات کیا ہیں، اُن میں سے کچھ کا ذکر یہاں نیچے کیا جا رہا ہے:

۱- بنیادی متن خود ایک اچھی، موثر یا اعلا تخلیق ہو۔

۲- اُس کے موضوع میں اتنی گنجائش موجود ہو کہ وہ ترجمہ نگار کے نفس میں اُس تخلیقی عمل کو متحرک کرے جس کے بغیر کوئی موضوع تخلیق کا درجہ نہیں پا سکتا۔

۳- زبان ایسی برتی گئی ہو جس کے تخلیقی مترادفات ترجمے کی زبان میں آسانی سے میسر آ سکیں۔

۴- موضوع کا تعلق ایسے انسانی مسائل سے ہو جو بلا لحاظ ملک و ملت ہر جگہ پائے جاتے ہوں یعنی وہ عالمِ انسانی کے آفاقی مسائل کا درجہ رکھتے ہوں۔ یا انسانی فطرت کے ایسے

Scanned with CamScanner

مظاہر سے تعلق رکھتے ہوں جو آفاقی نوعیت کے حامل ہیں مثلاً حسد، لالچ، خود غرضی، نفرت، محبت، دوستی، حسن و عشق، سخاوت، نیکی، بدی، انا، غیرت، بے ضمیری، ہوس پرستی، غریبی، ناداری وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے حامل متن میں ہی اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ترجمہ کرتے ہوئے ترجمہ نگار اُسے تخلیقِ نو کی منزل تک پہنچا دے۔ ایسے کسی متن کا ترجمہ کرتے ہوئے ترجمہ نگار جو راستہ اختیار کرتا ہے اُس کے کچھ نمایاں نشانات حسب ذیل ہیں:

۱- ترجمہ نگار ایسے فن پارے کا نہ تو لفظ بہ لفظ ترجمہ کرتا ہے نہ جملے سے جملہ ملاتا ہے بلکہ وہ پھر اس تخلیق کے مجموعی مفہوم کو موضوع بنا کر ترجمے کی زبان میں ایک نئے فن پارے کی تخلیق کرتا ہے۔ لیکن یاد رہے یہ عمل Adaptation کے عمل سے قدرے مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ اس میں Adaptation تصرف کی گنجائش ہوتی ہے جب کہ تخلیق نو میں نہیں۔

۲- وہ مجموعی مفہوم کو پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ بنیادی متن کے تاثر کو بھی ترجمے کی زبان میں بڑے موثر اسلوب کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

۳- بنیادی متن جس صنف کی صورت میں ہے اُسے ترجمے کی زبان میں اسی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی بنیادی متن اگر نظم ہے تو ترجمہ بھی نظم کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اگر افسانہ ہے تو وہی صورت اُس کو ترجمے کی زبان میں دی جاتی ہے۔

۴- بنیادی متن میں استعمال ہونے والے استعاروں، تشبیہوں، پیکروں اور علامتوں کے لیے اگر مناسب مترادفات ہاتھ آ جائیں تو بہتر ہے اگر نہیں تو اپنے تخلیقی عمل کی مدد سے نئے مترادفات یا تراکیب بنا کر اُن کو برتا جاتا ہے۔ یہ مترادفات معنوں کی طرفیں کھولنے والے ہوتے ہیں نہ کہ طرفوں کو بند گلی کی شکل دینے والے۔ یعنی معنوں کو وسعت عطا کرنے والے ہوتے ہیں، محدود کرنے والے نہیں۔

۵- کسی تخلیق کے ایسے ترجمے کے لیے جو تخلیقِ نو کا درجہ حاصل کر لے ضروری ہے کہ ترجمہ نگار خود بھی تخلیق کار ہو۔ اتنا ہی نہیں، شعری ترجمے اگر شاعر کریں، افسانوں کے افسانہ نگار، انشائیوں کے انشائیہ نگار، تو بہتر ہے۔ متعلقہ صنف سے تعلق رکھنے والا فن

Scanned with CamScanner

کار مصنف کے تقاضوں کا نباض ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف اس کی تفہیم کے مرحلے آسانی سے طے کر لیتا ہے بلکہ اپنے ادب سے واقف ہونے کی وجہ سے مترادفات تلاش کرنے میں بھی اُسے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

٦- کسی تخلیق کا ترجمہ اُسی وقت تخلیقِ نو کی منزل تک پہنچتا ہے جب ترجمہ نگار سورس لنگویج اور ٹارگٹ لنگویج کے مزاج کو ملحوظ رکھ کے اپنے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔

قاضی سلیم نے اپنے ایک تجربے کو اس سلسلے میں جس طرح اپنے مضمون میں پیش کیا ہے اُس سے اوپر پیش کی گئی دلیل کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بہت دن ہوئے ڈاوسن کی ایک نظم پسند آئی I love you in my own fashion۔ میں نے ترجمہ کیا: چاہا ہے میں نے اپنے ہی انداز میں تجھے۔ دی ہے صدا تو اپنی ہی آواز میں تجھے، بظاہر یہ دوسرا مصرع جو مقفّٰی ہے غیر ضروری تھا اس لیے کہ ترجمہ تو پہلے مصرعے میں مکمل ہو گیا۔ مگر یہی وہ کلیدی ٹکڑا ہے جس پر شاعر زور دینا چاہتا ہے My Fashion کے بجائے My own fashion کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ پڑھنے والے کی کچھ دیر توجہ جمائے رکھنے کے لیے ایک اور مصرع اس خیال کا آگے بڑھایا جائے اس لیے کہ آگے پوری نظم اسی دعوے کا جواز پیش کرتی ہے۔ مصرع ذہن میں بیٹھا رہے تو پھر آگے نظم جڑتی جائے:

کل رقص و مے کے دور بہت دیر تک چلے
جانے گا آہ کون مگر دل کے مرحلے
کیا کیا یہ چاہتا تھا کہ ہو تیز تر شراب
دیوانہ وار رقص کروں ساز چیخ اٹھیں
سعیِ سکونِ قلب اکارت مگر گئی
جب رقص تھم گیا تو قیامت گزر گئی

اس تجربے کا یہ مزاج مغربی ہے کہ ان کا روزمرہ کا معمول اور ہم سے کتنا مختلف ہے۔ ہمارے اپنے محبت کے ڈھنگ نہیں کہ ہم ہجر کی گھڑیاں

Scanned with CamScanner

رقص و مے کی محفلوں میں گزاریں یا کسی گل رخ کے لبوں کے لمس سے غم بھلائیں۔ اگر اس نظم کا لفظی ترجمہ کردیا جاتا تو واسوخت کا نیم مزاحیہ نتیجہ برآمد ہوتا۔ مشرقی مزاج یہ ہے کہ شب ہجر آنسوؤں کے سیلاب بہاتے گزرتی ہے یا وحشت میں جیب و گریباں چاک کر کے ہم جنگل میں نکل جاتے ہیں۔ ترجمہ کرتے وقت اس فرق کا احساس تھا اس لیے ہر موڑ پر مشرقی جذبات کی آمیزش سے محبت کو گہرا اور معتبر بنانا پڑا تب جا کر اس انداز کے محبت کرنے والے کے لیے ہمدردانہ فہم اور دردمندانہ یگانگت پیدا کی جاسکی تبھی مشرقی ذہن آگے آنے والے اشعار کی تہ میں محبت کے کرب تک پہنچ پایا:

میں نے کسی سے ہونٹ ملائے تو درمیاں
تیرا ہی عکس آگیا اور تشنگی رہی

دل کے مرحلے، تشنگی رہی، قیامت گزر گئی جیسے ٹکڑے سب الحاقی ہیں۔ محبت کو ماورائیت سے جوڑے بغیر ہم محبت کو ہوس کا نام دیتے ہیں۔ اس طرح کی پیوندکاری، ترجمہ نگاری کی کمزوری نہیں بلکہ فن کاری کا جزو ہے''۔

(شعری ترجمے کے آداب سے ماخوذ)

اوپر پیش کیے گئے طویل اقتباس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ کسی تخلیق کا لفظی ترجمہ ممکن ہی نہیں۔ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے جناب اے.ایل. ہاشم اپنی کتاب 'ہندوستان کا شاندار ماضی' میں شامل کیے رگ وید کے تراجم کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ان (رگ وید کے منتروں) میں اکثر لفظی تراجم نہیں ہیں کیوں کہ ہندوستانی کلاسیکی زبانوں کا کردار انگریزی کے کردار سے اتنا مختلف ہے کہ بہترین لفظی تراجم بالکل بے مزہ، بدترین اور یقینی طور پر مضحکہ خیز ہوجاتے۔ ان مقامات پر میں نے اصل متن سے گریز کیا ہے تاکہ مقصد قاری کے لیے واضح تر ہوجائے لیکن جہاں جہاں بھی ایسا ہوا ہے میں

Scanned with CamScanner

نے مصنفین کے مافی الضمیر کی اپنی فہم کے مطابق ایماندارانہ تعبیر کی کوشش کی ہے"۔

(شعری ترجمے کے آداب، از قاضی سلیم)

اصل متن سے گریز کرنے کے معنی اُسے بدلنا نہیں ہے۔ جب تک ترجمہ نگار کا مقصد اصل متن کے مفہوم کو گرفت میں لانا ہے وہ تصرف کے دائرے میں نہیں آتا لیکن جوں ہی ترجمہ نگار ترجمہ کرتے ہوئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ اصل متن کو یوں نہیں یوں ہونا چاہیے تھا وہ تصرف کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، اور اس طرح کا ہر ترجمہ جو خود کو اصل یا بنیادی متن سے بہتر اور اُس کی تکمیل تصور کرتا ہے تخلیقِ نو نہیں، تخلیقی تصرف کے دائرے میں آتا ہے۔

ان دونوں میں ایک اور بنیادی فرق یہ ہے کہ تخلیقِ نو کا مقصد بنیادی متن کی بہتر تفہیم ہوتا ہے جب کہ تصرف کا مقصد بنیادی متن کی بہتر تشکیل۔ ایک کا منشا بنیادی فن کار کے تخلیقی نہاں خانوں تک پہنچنا جب کہ دوسرے کا اپنے زعم میں اُس کی کمیوں کو دور کرنا۔ میں ذاتی طور پر تخلیقِ نو کو مثبت عمل تصور کرتا ہوں کیوں کہ یہ بنیادی فن پارے کی معنوی و ہیئتی تہ داریوں کو وا اور نئی جہتوں کو نشان زد کرتا ہے جب کہ تصرف کا عمل میرے نزدیک ایک منفی فعل ہے کیوں کہ وہ اصل متن کے محاسن کی بازیافت نہیں کرتا بلکہ اس کے وجود کو مسخ کر کے اُسے نیا رنگ و روپ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ تخلیق نو سے اصل متن کو پڑھنے کی خواہش قاری میں بیدار ہوتی ہے جب کہ تصرف سے اُسے بھول جانے کا رجحان عام ہوتا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے نیچے دو اقتباسات کو نمونتاً تخلیقِ نو اور تخلیقی تصرف کا روپ دیا جا رہا ہے تا کہ اوپر پیش کیے گئے فرق کی عملی صورت سامنے آ سکے:

بنیادی متن:

Loves Philosophy

Nothing in the world is single
All things by a law divine
In one another's being mingle
Why not I with thine?

(Shelly)

تخلیقِ نو:

Scanned with CamScanner

فلسفۂ محبت

(۱) کائنات کی کوئی شے تنہا نہیں ہے
دنیا کی جملہ اشیا فطرت کے اصول پر ہمکناری کی خواہش مند ہیں
پھر میں کیوں نہ اپنی ذات کو تیری ہستی میں فنا کر دوں
(مترجم ناظر کاکوروی)

فلسفۂ محبت

(۲) جگ بھر میں کوئی نہیں ہے خالی ہر چیز کو ہے لگن کسی کی
قدرت کا ہو میری جان یہ قانون ہو مجھ سے نفور تو ہے موزوں؟
(مترجم..................)

تخلیقی تصرف:

یہ کائنات تو ہے امن و آشتی کا مکاں
نہیں ہے کوئی یہاں بے اماں و آوارہ
نہیں ہے تنہا و افسردہ کوئی بے چارہ
بس اس اصول پہ قائم ہے ہستیِ امکاں!
رہے نہ کوئی دوئی، ہوں سبھی بہم دیگر!
چلن یہی ہے اگر کائنات کا ہم دم؟
تو کیوں نہ ہم بھی تم بھی آج ایک ہو جائیں
جھنک کے سارے گماں تجھ میں مجھ میں کھو جائیں
چلن یہی ہے اگر کائنات کا ہم دم؟
رہے نہ کوئی دوئی، ہوں سبھی بہم دیگر!
(ظہور)

بنیادی متن:

A third cause of disagreement between IQ measure and external criteria may be related to motivation. If we can lead a horse to the water, so we can send a child to school, but as we

Scanned with CamScanner

cannot make the horse drink, so we cannot make the child learn unless he is in fact motivatied.

(H.J. Eysenck: Check Your Own IQ)

تخلیقِ نو:

آئی کیو کے پیمانوں اور بیرونی یا اوپر سے لادے گئے معیاروں میں اختلاف کی تیسری وجہ کا تعلق تحرک سے ہے۔ جس طرح ہم گھوڑے کو پانی تک لے جاسکتے ہیں اسی طرح ہم بچے کو بھی اسکول بھیج سکتے ہیں۔ لیکن جس طرح گھوڑے کو پانی پینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اُسی طرح بچے کو اُس وقت تک نہیں سکھایا جاسکتا جب تک اُسے متحرک نہ کیا جائے۔

تخلیقی تصرف:

آدمی مشین نہیں ایک دھڑکتا ہوا دل اور فعال و آزاد ذہن والا وجود ہے۔ زور زبردستی سے اُس سے کام تو کرایا جاسکتا ہے پر وہ کام اچھا بھی ہو اس کا یقین نہیں دلایا جاسکتا۔ ہاں البتہ دلائل کی مدد سے قائل کر کے اُس سے کچھ بھی کرایا جاسکتا ہے۔ اُس کا حال اُس گھوڑے جیسا ہے جس کو ہم پانی تک تو لے جاسکتے ہیں پر پانی پینے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ اسی طرح بچے کو اسکول تو بھیجا جاسکتا ہے پر اُسے علم حاصل کرنے یا کچھ سیکھنے کے لیے اُس وقت تک تیار نہیں کیا جاسکتا جب تک مناسب تدابیر کی مدد سے اُسے ذہنی طور پر ہموار نہ کر لیا جائے۔

بنیادی متن:

When I first saw him, I thought, if I had not been let into his Character and Story, I could have discerned that he had been much separated from Company, from his Aspect and Gesture; there was a strong but cheerful seriousness in his Look, and a certain Disregard to the ordinary things about him, as if he had been sunk in Thought. When the ship which brought him off the Island came in, he

Scanned with CamScanner

received them with the greatest Indifference, with relation to the Prospect of going off with them, but with great satisfaction in an oppurtunity to refresh and help them. The man frequently bewailed his Return to the World, which could not, he said, with all its Enjoyment, restore him to the Tranquility of his Solitude.

(quoted in Gavin Young: Slow Boats Home)

تخلیقِ نو

جب میں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو میں نے سوچا اگر مجھے اس کے کردار اور کہانی کے بارے میں پہلے سے نہ بتادیا گیا ہوتا تو میں یہ نتیجہ اخذ کرتا کہ وہ اپنے رفیقوں سے بہت الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ اُس کی ظاہری صورت اور حرکات وسکنات بھی وہ نہیں تھیں جو اس کی پہچان تھیں۔ اس کی نگاہوں میں ایک خوش آئند گہری سنجیدگی مترشح تھی۔ اور اپنے اردگرد موجود عام چیزوں کو بھی وہ قدرے نظر انداز کر رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ جب وہ جہاز جو اُسے جزیرے سے لایا تھا لنگر انداز ہوا تو اس امکان کے تحت کہ اُسے اُن کے ساتھ جانا پڑے گا اُس نے اُن کا استقبال بڑی بے دلی سے کیا۔ لیکن اس سے اُسے بڑی تسکین ملی کہ اُن کے ساتھ جانے سے اُسے تازہ دم ہونے اور اُن کی مدد کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ دنیا کی طرف اپنی واپسی پر وہ بار بار آنسو بہاتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ یہ دنیا اپنی ساری خوشیوں اور لطافتوں کے باوجود اُسے من کی وہ شانتی اور سکون فراہم نہیں کرسکتی جو اُسے تنہائی سے حاصل ہوا تھا۔

تخلیقی تصرف:

تنہائی یا تو دیوتاؤں کو راس آتی ہے یا پیغمبروں، ولیوں اور فلسفیوں کو۔ عام انسانوں کے لیے یہ سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر مجھے پہلے سے اُس کے بارے میں معلوم نہ ہوتا تو میں یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ اُسے ایک عرصے سے اپنے ساتھیوں سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اُس کے آداب واطوار بھی پہلے جیسے نہیں تھے۔ اس کی نگاہوں سے ایک خوشگوار گہری سنجیدگی مترشح تھی اور وہ اپنے اردگرد کی اشیا میں بھی کوئی خاص دل چسپی نہیں لے رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو۔ شاید اسی وجہ سے جب وہ جہاز جو اُسے جزیرے سے نکال لایا تھا لنگر انداز ہوا تو یہ سوچ کے کہ اُسے

Scanned with CamScanner

اُن کے ساتھ جانا ہوگا اُس نے اُن کا بڑی بے دلی سے استقبال کیا۔ تاہم اُسے یہ اطمینان بھی تھا کہ اُن کے ساتھ جانے سے اُسے تازہ دم ہونے اور اُن کی مدد کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ دنیا کی طرف اپنے لوٹنے کا وہ رہ رہ کر ماتم کرتا رہا اور یہ کہتا رہا کہ یہ دنیا تفریح کے اپنے سارے خزانوں کے باوجود اُسے وہ اطمینانِ قلب فراہم نہیں کر سکتی جو اُسے تنہائی نے عطا کیا تھا۔

نیچے دیے گئے اقتباسات کو تخلیقِ نو اور تخلیقی تصرف کی شکل دیجیے:

1. THERE COMES A TIME WHEN SILENCE ISN'T GOLDEN
   Whether it's a telephone that does't ring, or a cherished instrument that sits silently in a corner, the twilight years of a musician can prove deathly quiet. After a life where the sound of applause was an everyday event, the silence can prove deafening. But you can help.
   (appeal for the Musician Benevolent Fund)
2. A small group of Englishmen conceived the idea of seeking a north-eastern passage to Asia through Arctic waters. As early as 1527 a small book had appeared prophesying such a discovery. One phrase rings out:'There is no land uninhabitable, nor sea unnavigable.'
   (quoted in Winston Churchill: A History of the English Speaking Peoples)
3. The moral fibre which sustained mid-Victorian Britain in its era of greatnest was derived only partly from the values of liberalism. The evils of philistinism, smugness, and bad taste were there from the first: it was when they ceased to be restrained and offset by the practice of the Christian virtues that the moral rot set in.

Scanned with CamScanner

(David Thomson: England in the Nineteenth Century)

4. The teacher can suggest the best distribution of time for adequite training. Should learning periods be long? Should we 'strike while the iron is hot', or should we do a little at a time and avoid fatigue? The optimum length for the learning periods will vary from task to task and the teacher should be able to advise. In general it is found that short periods with appreciable rest between are most economical.

   (C.J. Adcock: Fundamentals of Psychology)

نوٹ: انگریزی کے سارے اقتباسات Alan Duff کی کتاب Translation سے لیے گئے ہیں۔

ترجمہ بحیثیت ترجمانی یا تشریح

ترجمے کو ترجمانی یا تشریح کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ایک حد تک تو یقیناً ترجمہ ترجمانی یا تشریح کا کام بھی کرتا ہے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ترجمہ کلیتاً یہی کام کرتا ہے یا ہر ترجمہ ترجمانی ہی تک محدود رہتا ہے تو میرا خیال ہے یہ ترجمے کے فن اور اُس کے مقاصد کے ساتھ زیادتی ہی نہیں بے انصافی بھی ہے۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار کرنے والے حضرات اِس بات کو فراموش کر جاتے ہیں کہ جب ترجمہ خود کوئی ایک ہیئت ایک شکل نہیں رکھتا، نہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک طرح کے آلے استعمال کرتا ہے اور جب ترجمہ خود ایک بوقلموں شخصیت کا حامل ہوتا ہے تو پھر اُسے ترجمانی یا تشریح قرار دینا کہاں تک مناسب ہے غور طلب ہے۔

دوسری طرف ترجمانی و تشریح کے بھی کوئی ایک معنی نہیں ہیں۔ اُس کے استعمال کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔ غور کیجیے تو کہیں کوئی صورت تخلیقی ترجمے کے دائرے میں آتی نظر آتی ہے تو کوئی لفظی یا جملوی ترجمے کے دائرے میں۔ کسی کو تخلیق نو کہنا بہتر نظر آتا ہے تو کسی کو تخلیقی تصرف۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کسی ترجمے کو ترجمانی یا تشریح قرار دینے سے پہلے ہر طرح سے غور کر لیا:

ضروری ہے تاکہ ہماری بات خلطِ بحث کا شکار ہوکر موضوع کو واضح کرنے کی بجائے مزید مبہم کرنے کا باعث نہ ہو۔

ترجمے کی مختلف اقسام سے چوں کہ اِس سے قبل بحث ہوچکی ہے اس لیے آیئے یہاں سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کریں کہ ترجمانی یا تشریح کی کتنی اقسام ہوسکتی ہیں۔

ترجمانی کی پہلی قسم وہ ہے جس کا بنیادی مقصد ترسیل سے ہم کنار ہونا ہے۔ اس کا مقصد سامعین پر اپنے اظہار سے وہ اثر ڈالنا ہوتا ہے جو اس کا بنیادی مقصد ہے یا پھر کسی کو قائل یا متنبہ کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ کام تحریری متن کی وساطت سے بھی کیا جاسکتا ہے اور محض زبانی اظہار کے ذریعے بھی۔

ترجمانی کے ذریعے ہم مصنف کے خیالات، ایقانات، اعتقادات جاننے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہاں مقصد یہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے سامعین کو کس بات کے لیے قائل کرنا چاہتا ہے بلکہ صرف یہ جاننا ہوتا ہے کہ وہ کس کے لیے قائل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یعنی وہ کون سے خیالات، اعتقادات یا ایقان ہیں جن پر مصنف خود ایمان کی حد تک یقین رکھتا ہے۔

ترجمانی اُن خیالات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی کرسکتی ہے جو متن میں پوری وضاحت سے پیش نہیں کیے جاسکے۔ عام طور پر ہم کسی انسان کے صرف انہی خیالات کو جاننا نہیں چاہتے جو واضح طور پر پیش کیے گئے ہیں بلکہ اُن خیالات تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں جو واضح طور پر بیان نہیں ہوسکے یا بیان کی منزل تک پہنچ ہی نہیں پائے۔

ترجمانی یا تشریح کی ایک قسم وہ بھی ہے جس کے تحت اُن وجوہات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو کسی فرد کو اظہار کے لیے اُکساتے ہیں۔ اسے ترسیل کے نفسیاتی محرکات تک رسائی حاصل کرنے کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

ترجمانی کے ذریعے ہم مصنف کے خیالات کے نفسیاتی محرکات تک رسائی حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کون سا مسئلہ تھا جسنے مصنف کو متذکرہ متن تحریر کرنے کیلیے مجبور کیا۔ اور اس کے اُس مسئلے کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی جس کا اُسے سامنا تھا۔ یہاں مصنف کے ماحول کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے تاکہ اس کے خیالات کے تعین میں اس کے ماحول نے کہاں تک کردار ادا کیا، کی بھی جانکاری حاصل ہو۔

Scanned with CamScanner

ترجمانی کے ذریعے مصنف کے مفاہیم جن کی وہ ترسیل کرنا چاہتا ہے کو اس کے اظہار کے روایتی معنوں سے ممیز کیا جاسکتا ہے۔ ہر لفظ جو ہم استعمال کرتے ہیں وہ ایک روایتی مفہوم رکھتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم نے اُسے اُسی روایتی مفہوم کی ترسیل کے لیے برتا ہو۔ چناں چہ ترجمانی کے ذریعے ہم ان دونوں کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ترجمانی کسی متن کے مصنف کے مفہوم کو جاننے کی بجائے اُس مفہوم کی وضاحت کرنے کی بھی کوشش کرتی ہے جو کسی متن کی ساخت سے ابھرتے ہیں۔ اس طرح کی کوششیں لسانیات کے اُس نظریے سے متاثر ہوئی ہیں جسے ہم ساختیات کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ نیز اُس صوتی نظام کی بھی وضاحت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو متن کو مخصوص تاثراتی پیرہن عطا کرتا ہے۔

ہر متن کو جو کوئی مصنف لکھتا ہے اُس کا اثر قارئین پر پڑتا ہے۔ یہ قارئین متن کے مصنف کے ہم عصر بھی ہوسکتے ہیں اور مستقبل میں آنے والی نسلوں کے قارئین بھی۔ ان اثرات کی چھان بین کرنا بھی ترجمانی کے مقاصد میں شمار ہوتا ہے جن کو ہم دو طرح سے پیش کرسکتے ہیں
(۱) اثرات جن کو مرتب کرنا مصنف کا عندیہ ہے اور وہ جو اُس کے عندیے میں نہیں آتے۔
(۲) سامعین پر اثرات، دوسرے ادیبوں یا مصنفین پر اثرات، موجودہ تمدن سے اثرات وغیرہ۔
ادبی فن پاروں کے اثرات کا جہاں تک تعلق ہے اُن کا ہم ایک مخصوص انداز میں مطالعہ کرتے ہیں یعنی جمالیاتی اثرات جو وہ سامعین پر مرتب کرتے ہیں یہ مصنف کا عندیہ بھی ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔

ترجمانی دیے متن کی صداقت کو بھی جاننے کی کوشش کرتی ہے۔ متن میں جو حقائق بیان کیے گئے ہوتے ہیں یا جو بیانات دیے گئے ہوتے ہیں وہ سچ ہیں یا جھوٹ یہ جاننے کی بھی ترجمانی کے ذریعے کوشش کی جاتی ہے۔ خصوصاً جب کسی تاریخی دستاویز کی صداقت کو جاننا مقصود ہو تو دوسرے مصنفین سے تصدیق کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

کسی متن میں اگر کوئی قانونی یا فلسفیانہ دلائل بھی دیے گئے ہوں تو ان کی معقولیت کو بھی جاننے کی کوشش ترجمانی کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ یعنی یہ جاننا کہ وہ قانونی طور پر جائز بھی ہیں کہ نہیں۔ کسی متن میں جو فلسفیانہ دلائل پیش کیے گئے ہوتے ہیں اُن میں ہم کو کوئی کمی دکھائی دیتی ہے کبھی وہ معقول نہیں ہوتے، کبھی مصنف نے جو اصول وضوابط بنائے ہوتے ہیں اُن پر سوالیہ نشان لگ جاتے ہیں۔ چناں چہ اس طرح کی صورت حال میں ہم اُن میں خود کچھ اصول شامل کرکے،

Scanned with CamScanner

جنھیں مصنف نے برتا نہیں ہوتا یا اُس کی دسترس سے باہر رہے ہوتے ہیں انھیں شامل کر کے اُس کے ضوابط کو بدل دیتے ہیں۔ اس طرح کی شعوری تعمیرِ نو مصنف کے متن کے موضوع سے یا تو انحراف کرتی ہے یا پھر اُس کی معاونت۔ اس کوشش کے نتیجے میں ہم بنیادی متن کے مصنف کے خیال سے اختلاف کرتے ہیں۔ یہ اختلاف اُس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے جب ہم اپنے نظریاتی ایقانات پر مبنی از سرِ نو اصول مرتب کر کے اُس میں شامل کر دیتے ہیں۔

ترجمہ اقوامِ عالم میں افہام و تفہیم کا ذریعہ

یہاں سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ہم صرف کسی ایک زبان کے الفاظ کی جگہ دوسری زبان کے متبادل الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک زبان کے الفاظ کے مفاہیم کے ساتھ جو تمدنی انسلاکات ہوتے ہیں انھیں بھی دوسری زبان کے قارئین کے لیے اس میں منتقل کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ ہر زبان کا اپنا ایک تمدنی پیرا ہن ہوتا ہے۔ آداب و اطوار، رسوم و رواج اور فکر و گفتار کے لب و لہجے میں اپنی آن بان و شان ہوتی ہے۔ جس زبان کا ترجمہ کیا جارہا ہے وہ بھی اپنے منفرد تمدنی چولے میں ملبوس مزین ہوتی ہے اور جس میں ترجمہ کیا جارہا ہے وہ بھی۔ جب تک ترجمہ اس کھائی کو پاٹنے میں کامیاب نہیں ہوتا اس کے مفہوم کی درست ترسیل نہیں ہوسکتی۔ مثلاً انگریزی کے لفظ you کے لیے اردو میں کتنے ہی متبادل الفاظ ہیں۔ تم، آپ، جناب، محترم، موصوف، بزرگوار، خاتون، دلبر، دشمن وغیرہ۔ یہ سبھی الفاظ مختلف تہذیبی مراتب کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً ہم جب کسی سے ادب و احترام سے بات کرتے ہیں یا اُسے مخاطب کرتے ہیں تو تم کی بجائے آپ، جناب، محترم، کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح جب کسی بزرگ یا عمر میں اپنے سے بڑے سے مخاطب ہوتے ہیں تو آپ اور جناب کے ساتھ ساتھ 'بزرگوار' بھی استعمال کرسکتے ہیں۔ طنزیہ لب و لہجے میں اگر انھیں چار کو استعمال کرتے ہیں تو معنی بالکل بدل جاتے ہیں۔ کسی عورت سے مخاطب ہیں تو 'خاتون' کا لفظ کئی مفاہیم کی ترسیل میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ سامنے اگر محبوبہ ہے تو 'دلبر' ہمارے جذبے کی کئی پرتیں کھولنے کا موجب بنتا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ یہ وہ تہذیبی شاہے ہیں جنھیں کوئی انگریز کیوں کر سمجھ پائے گا اس لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ان آداب و اطوار کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے جنھیں سمجھے بغیر یہ پتا نہیں چل سکتا کہ 'تم' کا لفظ استعمال کرنے والا بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہا ہے یا حقارت کا۔ آپ، محترم یا جناب کہنے والا واقعی احترام کر رہا ہے یا طنز کے تیر برسا کر اپنے مخاطب کا سینہ چھلنی کر رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

اب ذرا رُک کر اُس بات پر غور کیجیے جو میں نے اوپر کہی ہے کہ ہر زبان اپنا ایک منفرد تہذیبی مزاج رکھتی ہے۔ سورس لنگویج سے جب کوئی تحریر ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کی جاتی ہے تو الفاظ کے مفاہیم کے انتقال کے ساتھ ساتھ وہ تہذیبی مزاج بھی منتقل کرنا ضروری ہو جاتا ہے جو اُس کا جزو لاینفک ہے۔ مثلاً اردو زبان میں 'بارات' کے معنی دولھے کے ایک مخصوص لباس میں سہرا باندھ کر اور گھوڑے پر سوار ہو کر دلہن کے گھر جانے کے ہیں۔ زیادہ تر علاقوں میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن ہندوستان کے کچھ قبائلی علاقوں میں بارات لڑکی والوں کی طرف سے آتی ہے۔ یعنی لڑکی پالکی میں بیٹھ کر دولھے کو لینے کے لیے جاتی ہے۔ ہم اگر ایسی ہی کسی قبائلی زبان میں بارات کے لیے مخصوص کسی لفظ کا ترجمہ کر رہے ہیں تو جب تک اس تہذیبی بعد کی وضاحت نہیں کرتے مفہوم کی ترسیل اُس طرح سے نہیں ہو سکتی جو یہاں ضروری ہے۔ محض شادی کہہ دینے سے اُس قبائلی تمدن سے اردو کا طالب علم ہرگز آشنا نہیں ہو سکتا۔ یہ وضاحت مختلف طریقوں سے کی جا سکتی ہے: حوالے کا نشان ڈال کر حاشیے میں وضاحت کر کے یا پھر متن کے اندر ہی یہ کہہ کر کہ 'لڑکی بارات لے کر دولھے کو لینے کے لیے اُس کے گھر گئی'۔ اسی طرح اگر ہم ترجمہ کشمیری یا ڈوگری زبان سے اردو میں کر رہے ہیں اور بنیادی متن میں 'رف' اور 'کڈ' کا ذکر آتا ہے یعنی بنیادی متن کا مصنف یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی خاص موقعے پر کسی جگہ 'رف' یا 'کڈ' ہو رہا تھا تو ترجمے میں رقص کی ان دونوں قسموں سے متعلق معلومات فراہم کرنا ضروری ہو جائے گا۔ 'رف' کشمیری رقص ہے جس میں صرف خواتین حصہ لیتی ہیں اور 'کڈ' وہ ڈوگرہ رقص ہے جس میں کبھی تو صرف مرد حصہ لیتے ہیں اور کبھی خواتین و حضرات دونوں۔ یہاں ترجمے میں ہم صرف 'رقص' کا لفظ استعمال کر کے ترجمے کا حق ادا نہیں کر سکتے کیوں کہ ترجمے کا ایک مقصد معلومات میں اضافہ کرنا بھی ہے۔

تمدن کا زبانوں سے اتنا گہرا رشتہ ہے کہ اُن کے ترجمے کے بارے میں اکثر اس طرح کے جملے استعمال ہوتے نظر آتے ہیں:

"One does not translate languages but cultures"

یا

"In translation we transfer cultures not languages".

لسانیات سے متعلق دنیا میں کچھ دبستان ایسے بھی ابھرے ہیں جنھوں نے تمدن اور ترجمے کے درمیانی رشتوں کو مستحکم کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے اوپر پیش کیے معروضات کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی:

Scanned with CamScanner

The Prague Schoolof linquistics or British Contextualism, schools which conceived of language as Primarily a social phenomenon, which is naturally and inextrically intertwined with culture. In these and other social linquistically and contextually oriented approaches, language is viewed as embedded in culture. The meaning of any language can be properly understood only with reference to the cultural context enveloping it. Since in translation 'meaning'is of particular inporlance it follows that translation can not be fully understood outside a cultural frame of reference."۵

مندرجہ بالا جن دو لسانی اسکولوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن کے وجود کی انفرادیت ہی اس نظریے پر قائم ہے کہ ترجمہ تمدنی انسلاکات کو نظر انداز کر کے ہو ہی نہیں سکتا۔ زبان کے وجود میں تمدن کا خون اُسی طرح دوڑتا ہے جس طرح انسانی رگوں میں خون زندگی کی حرارت پیدا کرتا ہے۔

بہر حال تمدنی ترجمے میں دقت اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب سورس لنگویج اور ٹارگٹ لنگویج دونوں ایسے تمدنی دھاروں سے وابستہ ہوں جن کے بیچ مغاہمت پیدا کرنا کاردارد ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال میں بنیادی متن (S.L.) کے تمدنی انسلاکات کو دوسری زبان (T.L) کے قارئین کے لیے کیوں کر قابلِ فہم بنایا جائے ایک ایسا مسئلہ بن جاتا ہے جس کو حل کرنے میں کسی ترجمے کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ہمارے دانشوروں نے اگر چہ بہت سے راستے بجھائے ہیں پر سب سے اطمینان بخش بات وہی ہے جس کو Waard اور Nida نے اس اقتباس میں پیش کیا ہے:

All peoples have more cultural similarities than is usually thought to be the case. What binds people together is much greater than what separates them. In adjusment to the physical

Scanned with CamScanner

environment in the organization of society, in dealing with crucial stages of life (birth,pulerty,marriage and death) in the development of elaborate ritual and symbolism, and in the drive for aesthetic expression........ people are amazingly alike. Because of all this translation can be undertaken with the expectation of communicativeeffectiveness."

The Problems of Translation Linguistic and Cultural

ترجمے کے لسانی وسماجی مسائل

ترجمہ ایک ایسا جوہر ہے جو بے محنت پیہم قطعاً نہیں کھلتا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ترجمے کا تعلق دو زبانوں سے ہوتا ہے۔ یعنی کسی ایک زبان میں موجود تحریر کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی بخوبی معلوم ہے کہ زبانیں محض الفاظ کا انبوہ نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے وجود میں ایک مخصوص لسانی کینڈے، مخصوص لب و لہجے اور زندگی کے مخصوص آداب و اطوار کا نظام لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ زبانیں بولنے والوں کے تہذیب وتمدن اور احساسات و جذبات کے اظہار کے مخصوص اسالیب لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ چناں چہ ترجمہ کار، ترجمہ کرتے وقت اِن سبھی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مفہوم کی ترسیل کے تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زبانوں کو اُن کے لسانی وتمدنی انسلاکات سے الگ کرنے کا مطلب اُن کی بے حرمتی کرنا اور افہام وتفہیم کی راہیں مسدود کرنا ہے۔

جب کسی ترجمے کے لسانی مسائل کی بات کی جاتی ہے تو اُس کے معنی کسی بھی جملے میں الفاظ کی نشست و برخاست، افعال کی ترتیب وتنظیم اور قواعد کے جملہ نظام سے کماحقہٗ واقفیت رکھنے کے ساتھ ہی ساتھ مختلف صورتوں میں الفاظ کی معنوی جہتوں اور وسعتوں کا ادراک حاصل کرنا یا اس شعور سے بہرہ ور ہونا بھی ہوتا ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ سورس لنگویج کے کسی متن میں جملوں کی جو ساخت ہے اُسے ٹارگٹ لنگویج میں منتقل کرنے کے لیے کس طرح کی ساخت کو برتنا

Scanned with CamScanner

ضروری ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ دونوں زبانوں کے نحوی، صرفی و معنوی نظام سے پوری واقفیت ہونا ترجمے کے لیے بہت ضروری ہے۔ صرف یہی نہیں کسی متن میں جملوی ساخت کے ساتھ ساتھ جو اسلوبیاتی نظام کارفرما ہوتا ہے اور جو کسی متن کو وہ انفرادیت عطا کرتا ہے جو ادیب کی شناخت بنتا ہے اُس کے انتقال کے بغیر بھی متن کی تفہیم کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی اس بات کو ایک مثال کی مدد سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ غبار خاطر کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''زندگی کے بازار میں جنس مقاصد کی بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی متاع کی جستجو میں مبتلا ہوگیا ہوں، یعنی اپنی کھوئی ہوئی تندرستی ڈھونڈ رہا ہوں، معالجوں نے وادیِ کشمیر کی گل گشتیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا۔ چناں چہ گزشتہ ماہ کے اواخر میں گلمرگ پہنچا اور تین ہفتہ تک مقیم رہا۔ خیال تھا کہ یہاں کوئی سراغ پاسکوں گا مگر ہر چند جستجو کی، متاعِ گم گشتہ کا کوئی سراغ نہیں ملا''۔

پورے اقتباس کا مفہوم صرف یہ ہے کہ'' کھوئی ہوئی صحت کو بحال کرنے کے لیے کشمیر آیا تھا، تین ہفتے تک گلمرگ میں مقیم بھی رہا پر گوہر مراد حاصل ہونا تھا نہ ہوا''۔ اب اگر انگریزی زبان میں ترجمہ کرنا مقصود ہے اور صرف اتنے مفہوم کا ہی ترجمہ کیا جاتا ہے تو مفہوم کا تقاضا پورا نہیں ہوتا کیوں کہ ترجمے کا مقصد صرف مفہوم کا انتقال نہیں ہے متن کے اسلوب کو بھی جہاں تک ممکن ہو منتقل کرنا ضروری ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی اُس شعری رومانیت، شگفتگی اور فلسفیانہ اندازِ تخاطب کو اگر ٹارگٹ لنگویج میں منتقل نہیں کیا جاتا تو ترجمہ اُس جمالیاتی حسن سے محروم رہ جاتا ہے جو دراصل بنیادی متن کی جان ہے۔ لیکن یاد رکھیے، یہ مقصد لفظی ترجمے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ نگار کو اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انگریزی زبان میں اُس دل نشینی اور شگفتگی کو بھی منتقل کرنا ہوگا جو مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی پہچان ہے۔ اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اُسے انگریزی کے جن نثر نگاروں کا مطالعہ معاون ہوسکتا ہے اُن میں بیکن اور ایڈیسن خصوصاً قابلِ ذکر ہیں۔ اب آیئے تھوڑی دیر کے لیے اس اقتباس کو انگریزی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"A lot many things I wished to achieve from the bazar of life. But now the desire to achieve a new thing has over whelmed me i.e I am

Scanned with CamScanner

searching for my lost health. The doctor's have advised to search it in the flower hedecked walks of the vale of Kashmir. Hence I arrived at Gulmarg towards the end of lost month and stayed for three weeks. I thought ,I would find some clues here but despite many efforts no clue could be found out of the lost wealth."

یہ میری ایک ادنا سی کوشش ہے کوئی بہتر ترجمہ کار جو انگریزی پر ہر طرح سے پوری گرفت رکھتا ہو اس سے کہیں بہتر ترجمہ کرسکتا ہے۔ وہ رومانی شگفتگی جو اصل کی پہچان ہے ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش تو کی گئی ہے پر مجھے معلوم ہے جو مقصود تھا وہ پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

آیئے اپنی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے انگریزی کے مشہور ادیب کپلنگ کی کتاب جس کا عنوان Just so stories ہے، سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے کم سے کم اس بات کا اندازہ ہو سکے گا کہ ترجمہ کار کو کس کس طرح کے لسانی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جنھیں سلجھائے بغیر اُس کا کام مکمل نہیں ہوتا۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"On the sea, once upon a time, O my best beloved, there was a whale, and he ate fishes. He ate the starfish and the garfish, and the crab and the dab, and the plaice and the dace and the skate and his mate and the mackereel and the pickereel, and the truly twirly-whirly eel. All the fishes he could find in the sea he ate with his mouth-so!"

(Kipling-1986)

(Translation Studies - Perspectives on an emerging Discipline)

Ed. by Alesandra Riccardi

اس اقتباس کا مفہوم تو اتنا مشکل نہیں ہے لیکن کپلنگ نے اپنے جملوں میں قافیوں کا جو التزام کیا ہے اُس سے اقتباس کو ایک ایسا آہنگ ملتا ہے جس کے انتقال کے بغیر ترجمے کا حق ادا نہیں

Scanned with CamScanner

ہوسکتا۔ اس فضا بندی کو دوسری زبان میں اُسی وقت منتقل کیا جا سکتا ہے جب اُس میں بھی قدرت ہو جتنی انگریزی زبان میں ہے۔ آیئے ہم اس اقتباس کو اردو میں ترجمہ کرنے کی کو س کرتے ہیں:

"او میرے بہترین محبوب ایک دفعہ کی بات ہے کہ سمندر میں ایک وہیل مچھلی رہتی تھی جو مچھلیوں کو کھاتی تھی۔ وہ اسٹارفش تارا مچھلی اور غارفش کریک کیکڑے اور ڈیب، پلیس اور ڈیس، اسکیٹ اور اس کے میٹ، میکریل اور پکریل اور نورلی اور ورلی ایک غرضیکہ اُسے سمندر میں جتنی قسم کی بھی مچھلیاں ملتیں وہ انھیں نگل جاتی۔"

اردو زبان کے پاس کئی مچھلیوں کے جو نام موجود ہیں اُن سے اُس طرح کی قافیہ بندی کا التزام ممکن نہیں جس طرح انگریزی کے الفاظ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ چناں چہ قافیوں کی وجہ سے جو فضا بندی ہوئی ہے وہ تارا مچھلی، کیکڑے، مربع مچھلی، ماکرل یا پکرل وغیرہ لکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتی اس لیے اردو کے ترجمے سے وہ لطف قاری کو حاصل نہیں ہو سکتا جو انگریزی کے اقتباس سے اُسے حاصل ہوتا ہے۔

حواشی:

1. ترجمہ: نوعیت اور مقصد، مشمولہ 'ترجمہ کا فن اور روایت' مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، ص ۶۹۔
2. ایضاً ص ۷۱، ۷۲۔
3. ترجمے کے اقسام کے سلسلے میں رمن پرساد سنہا کے مضمون Theory East and West: مشمولہ Translation, Text and Translations in its diffrent contexts Theory The paradigm of India، مرتبہ رکمنی بھایا نائر سے مدد لی گئی، بلکہ بنیادی متن کے کچھ اقتباسات کو ترجمہ کر کے شامل کر لیا گیا۔
4. بحوالہ 'فنِ ترجمہ کے اصول و مبادیات' از مرزا حامد بیگ، مطبوعہ 'اوراق' لاہور، شمارہ نمبر---، سال ---، ص ۱۱۹۔
5. JuFan House. Universality versus culture specificity in Translation. Translation studies. perspective on an emerging discipline. edited by Alessandra Riccardi
6. (bid P.102) (------ universal press P.502) P.92

☆☆☆

Scanned with CamScanner

rekhta
Scanned with CamScanner

ISBN 81-87394-37-4
9788187394372

SEEMANT PRAKASHAN
922, Kucha Rohella Khan, Daryaganj,
New Delhi-110002 (INDIA)
Ph. : 23270284

Scanned with CamScanner